عبدالعزیز خالد

ہتھ بنھّ غلام نیں لفظ تیرے تیری باندی اے ازلوں زبان خالد
لہجہ قادر کلامی دا شاعری وچ جادوگری اے تیرا بیان خالد
تیرے فن دا رنگ نویکلا اے تُوں ایں شعر تے اَدب دا مان خالد
سدا روپ سنواریں تُوں سدھراں دا تیرا فکر رہے سدا جوان خالد

تیری سوچ اُڈاریاں ماردی اے راہواں دسدا اے تینوں خیال خالد
اُچّا ذہن تے سُچّا سبھا تیرا تُوں ایں جگ تے اپنی مثال خالد
لو ونڈاوا رہنا ایں ویلیاں نوں تیرا اُچّ تے رہندائے کمال خالد
سدا چمکیں تُوں شعر دے انبراں تے تینوں آوے نہ کدی زوال خالد

حفیظ تائب

غوثِ سخن

وہ فکر و فن کا تشخّص، وہ اعتبارِ قلم
وقارِ بتکدۂ شعر، آبروئے حرم

وہ نُدرتوں کا پیامی، وہ جدّتوں کا سفیر
وہ زندگی کا تبسّم، وہ آگہی کا بھرم

اُفق سے تا بہ افق اس کے تجربوں کی دھنک
کراں سے تا بہ کراں پھیلتی بہارِ شمیم

عُلوم کی نئی دُنیاؤں کا کولمبس وہ
ستارہ بوس ہے اس کی تلاش کا پرچم

وہ ہے نواگرِ فطرت کی منفرد آواز
وہ ہے شہنشہِ عالمؐ کا شاعرِ اعظم

نہیں تعلّی بے جا اگر وہ کہتا ہے
"بگردنِ شعرائے زماں نہم پایم"

میں اس کو غوثِ سخن مانتا ہوں اے تائب!
رہے گا اس کے ادب کیلئے مرا سر خم!

ذوقی مظفر نگری

عروسِ آگہی

فکر کی تابندہ لہروں میں شعاعِ طُور ہے
تیری نعتوں میں رواں دریائے رنگ و نور ہے

پاک ہے تیری زباں، تیرا تخیّل باوضو
تیرے فن پاروں میں ہے سوز و گدازِ آرزو

تُو ہے سودا کی تمنّا، تُو ہے غالب کی مراد
کر دیا ہے تُو نے روحِ شاعرِ مشرق کو شاد

بحرِ مشکل کا شناور، عالمِ علمُ البیاں
موجِ تشبیہات کے سینے پہ رہتا ہے رواں

کس قدر پُر سوز ہے، تیرا یہ اندازِ غزل
گرمیِ اشعار سے پتھر بھی جاتے ہیں پگھل

خُون کے صحراؤں سے گزرا ترا ذوقِ سعید
تُو نے صنفِ نظم کو بخشا ہے اک رنگِ جدید

تیری تمثیلات ہیں حرف و صدا کی آبرو
تیری لوحِ فن پہ ہیں انمٹ نقوشِ جستجو

سج گیا ہے علم و فن سے تیرا قصرِ زندگی
کیوں نہ چُومے تری چوکھٹ کو عروسِ آگہی

پڑھ کے تحریریں تری ذوقی نے لکھا بے گماں
تیرا فن بھی جاوداں ہے اور تُو بھی جاوداں

کرشن موھن

فسونِ خالد

خیال و خامۂ خالد کی پیہم سحر سامانی
وہ لفظوں اور تلمیحوں کی حیرت زا فراوانی

دقائق علم و فن کے بانکپن سے جلوہ گستر ہیں
حقائق کے بیانِ پُرفسوں میں ہے وہ لاثانی

کھلاتا ہے چٹانوں پر بھی رنگیں پھول روز و شب
ہے پتھریلی سے پتھریلی زمیں اس کیلئے پانی

طریقِ عامیانہ سے جدا ہیں اس کی تحریریں
ہے وہ ایسا مفکر جس کے فکر و فن میں لافانی

اسے ہے ارتباطِ خاص علموں اور زبانوں سے
ہے پیدا اس کی ہر تخلیق سے لطفِ ہمہ دانی

تراجم ہوں کہ تمثیلیں، غزل ہو نظم ہو کچھ ہو
ہے اس کی شاعری میں جلوہ ساماں دردِ انسانی

عیاں ہے اس کے اشعارِ حسیں سے پیار دھرتی کا
کمالِ عشق کی مظہر ہے اس کی گل بداماں

ہمیں ہے کرشن موھن ناز اس کیف آفریں فن پر
زبان و علم کے جو اک نئے سنگم کا ہے بانی!

عبدالعزیز خالد

سیّد نذیر نیازی

خالد سے ملا تو نپولین کے وہ الفاظ جو واٹمار میں گوئٹے کو دیکھ کر بے اختیار اس کی زبان سے نکلے یاد آ گئے۔ میں گوئٹے نہیں خالد کو البتہ گوئٹے سے ایک نسبت ہے۔ میں نپولین بھی نہیں لیکن خالد میدانِ شاعری کے نپولین ضرور ہیں۔ کہا جاتا ہے گوئٹے نپولین سے ملنے گیا یا نپولین گوئٹے سے۔ نپولین اسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ Voila, un homme! نپولین کے اس فرانسیسی جملے کا ترجمہ ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ہے۔ بہت مشکل شاید اس کا مفہوم یوں ادا ہو سکے "واہ وا ایک انسان!" یا پھر ہم یوں سمجھیں کہ دہلی انسانوں سے خالی ہوئی تو افراتفری کے اس عالم میں حالی کے دل و دماغ کی جو کیفیت تھی کم و بیش وہی نپولین کی حالی کا کہنا تھا۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

شاید یہی احساس نپولین کا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ حالی کی تعلّی میں انکسار کا رنگ ہے۔ نپولین کے انکسار میں تعلّی کا جس میں بتقاضائے حالات وہ ایک حد تک مجبور تھا۔ نپولین بہت نیچے درجے سے ابھرا۔ وہ عزت اور شہرت کی جن بلندیوں پر پہنچا۔ مشاہیر عالم کی جس صف میں جگہ لی۔ اپنے وصف ذاتی۔ محنت اور قابلیّت کے سہارے۔ وہ سمجھتا تھا انسان کی قدر اس کے جوہرِ ذات سے ہے کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اس کی پرورش سے، حسب و نسب، دولت اور اقتدار سے نہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ بات ہر کسی کے دل میں اتر جائے۔ وہ طرح طرح سے اس کا اظہار کرتا۔ کبھی کہتا لفظ ناممکن کو لغت سے خارج کر دو۔ کبھی کہتا تاریخ کیا ہے کسی فرد کی سوانح حیات!

کسی عسکری مہم پر جاتا تو بالالتزام والٹیئر کے اس ڈرامے کو دیکھنے کا اہتمام کرتا۔ جس کا عنوان اس نے حضور رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسمِ گرامی پر قائم کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ والٹیئر نے اسی آیت ہی کے زیر اثر ڈرامے کی ابتدا ان الفاظ سے کی کہ انسان کی عظمت اس کے جوہرِ ذات سے ہے۔

بات دور نکل گئی۔ کہنا یہ تھا کہ میں نے خالد کا نام سن رکھا تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ نظم بھی نظر سے گزر جاتی۔ ایک روز کسی ماہنامے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ نگاہیں ایک مضمون پر جم گئیں۔ عنوان یاد نہیں رہا۔ نہ مضمون نگار نہ ماہنامے کا نام۔ یاد ہے تو یہ کہ مضمون نگار کوئی اجنبی اہلِ قلم نہیں تھا بلکہ خالد کا ہمدمِ دیرینہ جس نے خالد کی مشقِ سخن، خالد کی سخن گوئی کے مختلف

مراحل پر نظر ڈالتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ خالد سے چند در چند گفتگوؤں کے بعد بالآخر طے ہوگیا کہ خالد کی منزل کیا ہے۔ خالد کی شاعری اپنے حقیقی مقام پر آگئی ہے۔ میں نے یہ مضمون دیکھا تو طبعاً شوق پیدا ہوا کہ خالد کا کلام بالاستیعاب مطالعہ طلب ہے۔ متاثر میں اس سے پہلے بھی تھا۔ اب جو مختلف مجموعوں پر نظر ڈالی تو جی چاہا کہ خالد سے ملوں بات چیت کروں۔ لیکن خالد کہاں رہتے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کچھ پتہ نہ چلا! کئی برس گزر گئے۔ اتفاقاً ایک روز قیوم نظر آئے۔ کہنے لگے: "چلیئے انکم ٹیکس کمشنر سے ملنا ہے!" میں نے کہا: میں تو ان سے واقف نہیں۔ کہنے لگے: وقت دیا ہے چلیئے اور جلد چلئے۔ معاملہ انکم ٹیکس کا تھا۔ کوئی وفد کمشنر صاحب سے مل رہا تھا۔ مجھے بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔

یہ تقریب تھی حضرت خالد سے ملاقات کی۔ دفتر پہنچے اطلاع کی۔ اذنِ باریابی ملا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا خالد صاحب سرتاپا تواضع کھڑے ہیں۔ ایک ایک سے ہاتھ ملایا۔ مجھ سے مصافحے کی نوبت آئی تو کہنے لگے "اقبال کے حضور میں" کا دوسرا حصہ کب شائع ہو رہا ہے؟ وفد زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ مگر اس سرسری ملاقات ہی میں خالد یوں ملے جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔ برسوں سے تعلقات۔ سوچتا رہا یہ خالد ہیں۔ انکم ٹیکس کمشنر۔ مگر غرورِ سخن وری نہ افسری کا دم خم، نہ تکلف نہ تصنع نہ دوری نہ بیگانگی۔ بلکہ سرتاپا شرافت، سرتاپا اخلاق۔ سرتاپا انکسار خلوص اور مروّت۔ نپولین کی زبان میں کہوں یا حالی کے الفاظ میں، ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں!

یہ تو تھی اور ہے خالد کی شخصیت۔ بات یہ ہے کہ شاعر ہو یا ادیب، فلسفی یا دانشور۔ علم و فضل ہو۔ مذہب اور روحانیت اخلاق اور عمل۔ یا بلحاظ دیگر زندگی کا کوئی پہلو ہو۔ اس میں کمال کے باوجود شخصیت نہیں۔ تو ایسے اہلِ کمال کچھ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے خالد کی شاعری سے پہلے خالد کی شخصیت کا ذکر کرنا پڑا۔ شاعر اگر اسرارِ حیات کا گرہ کشا، زندگی کا ترجمان انسان کے ظاہر اور باطن، دل اور دماغ کا راز دار ہے۔ تو اس کا پرتو اس کی ذات میں بھی تو نظر آنا چاہیئے۔ یہی خوبی ہے جیسی اس کی ذات ویسے اس کی شاعری۔ کہ اسے دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑا:

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ۔۔۔ کہ شاخِ زندگیٔ ما ہنوز نمناک است

بحمد اللہ جہانِ شاعری آباد ہے۔ نہال شعر تر و تازہ ہے۔ اس کے رگ و ریشے میں زندگی جوش مار رہی ہے۔ اربابِ فن کی دنیا ایجاد و طباعی سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ خم خانۂ سخن کو ایک نیا ساقی مل گیا۔ عالمِ اسلام کو ایک اور شاعر

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود
ویں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

میں نے کہا تھا خالد میدانِ شاعری کے نپولین ہیں۔ نپولین کی سپہ سالاری کا کسے اعتراف نہیں؟ نپولین نے بلادِ یورپ کو روند ڈالا۔ ایک کے بعد دوسرا معرکہ سر کیا۔ خالد کی قادر الکلامی کی کیا دنیا قائل نہیں؟ خالد نے بھی ایک کے بعد دوسرا معرکہ سر نہیں کیا؟ نظم میں، ابیات میں، قطعات میں، رباعیوں میں، مثنویوں میں، ترجموں میں، تمثیلوں میں۔ اقلیمِ سخن کے

کسی خطّے میں یلغار نہیں کی ؛ لیکن نپولین کی طرح اسے روندا نہیں، اس کی آبیاری کی ہے۔ حقائق اور معانی کے پھول کھلائے ہیں۔ نپولین ایک لشکرِ جرار لیے مصر پر حملہ آور ہوا۔ تو اربابِ ہنر و حکمت و دانش کی ایک جماعت بھی اس کے ساتھ تھی۔ خالد بھی جہاں گیا۔ الفاظ کے ایک لاؤ لشکر، روایات، و اساطیر کے ایک جمِ غفیر، مصطلحات و تلمیحات کے ذخائر، رموز و کنایات اور استعاروں اور تشبیہوں کی فوج در فوج کے ساتھ۔ لیکن جہاں نپولین کی قسمت میں آخر آخر شکست لکھی تھی۔ جہاں رُوس سے اسے ناکام پسپا ہونا پڑا۔ وہاں خالد کے پاؤں فتح و ظفر نے چُومے۔ خالد کے لیے پسپائی نہیں ہے۔ اقدام ہے۔ مسلسل اقدام۔ خالد آگے بڑھ رہا ہے بڑھتا رہے گا۔

البتہ تعجّب ہے تو یہ کہ دلدادگانِ سخن خالد کی دقّت پسندی سے پریشان ہیں۔ انہیں لغت پر عبور نہیں ہوگا۔ تو خالد کی شاعری کیسے سمجھ میں آسکے گی ؟ اور پھر لغت بھی ایک نہیں۔ اردو۔ ہندی، عربی، فارسی، حتیٰ کہ عبرانی، سریانی، ترکی بلکہ کئی مغربی زبانیں، یونانی، اور لاطینی۔ انہوں نے کتبِ اساطیر کی ورق گردانی نہیں کی تو خالد کی تلمیحات، خالد کے اشارات و کنایات سے کیسے لطف اُٹھائیں گے ؟ انہیں فلسفے پر عبور نہیں۔ علم و حکمت سے بے خبر ہیں۔ مذہب سے ناواقف، تاریخ سے نابلد۔ تہذیب و تمدن اور اقوام و امم کا گذر جن مراحل سے ہُوا۔ انسان پر کیا کچھ بیتی۔ اخلاق اور عمل کی راہیں کیسی دشوار ہیں۔ خیر و شر کی آویزش کیسی جانگداز ہے۔ اگر وہ ان باتوں کو نہیں جانتے تو کیا خالد کی شاعری کے معنی پا سکیں گے ؟ مگر وہ یوں کیوں نہیں سوچتے کہ خالد کی شاعری ایک درسِ ہدایت ہے ایک گنجینۂ معرفت۔ انہیں خالد کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ خالد کی نظر انسان پر ہے۔ زندگی پر۔ اس کی مصلحتوں اور نزاکتوں، اس کے خیر و شر، ابتلا و آزمائش پر۔ ان روایات پر جو ایک عالمگیر انسانیت کا تار و پود ہیں۔ اس دین پر جو حُسنِ سیرت اور تعمیرِ شخصیّت کا راز دار ہے۔ مختصراً اسلام پر کہ انسان اور کائنات کا صورت گر زندگی کی روح اس کی امید، عنایت اور سہارا۔ کہ امورِ انسانی میں ہمیشہ سے کارفرما ہے اور رہے گا۔

خالد کا دامانِ شاعری وسیع ہے۔ اس نے دنیا بھر کو سمیٹ لیا ہے۔ جس کا لبا اوقات ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی شکایت نہ کیجئے۔ کیا آج تک کسی نے گوئٹے اور رُومی، شیکسپیئر، ملٹن، سپنسر، یا غالب اور بیدل یا اقبال کی شکایت کی ؟ ان کا اشہب خیال انسان اور کائنات، زندگی اور اس کے حقائق، تاریخ اور تہذیب و تمدن کے ہر ہر گوشے میں پہنچتا ہے کہ اس کا ساتھ دینا آسان نہیں رہتا۔

سیالکوٹ میں ایک تقریب تھی۔ کہا گیا خالد پر عوام کا بھی کچھ حق ہے۔ عوام اگر کالانعام نہیں بلکہ خیر الانام ہیں تو میں سمجھتا ہوں خالد یہ حق ادا کر چکا۔ انسان کی روداد حیات گناہ اور شر سے ملوّث ہے۔ اس میں ظلم ہے، بیدردی ہے، سفّاکی ہے، سنگدلی ہے، قتل و غارت گری ہے۔ آبرو ریزی ہے۔ لوٹ مار ہے۔ جرم ہے۔ ظلم و ستم ہے۔ نا انصافی جبر و قہر، غصب و تغلّب، مردم آزاری۔ فرعونیّت۔ غرضیکہ کونسا گناہ ہے۔ جو ابنِ آدم سے سرزد نہیں ہُوا۔ پاکستان کی اس قوم کو جو کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری ہے۔ مزدور کی بیٹی اور سرمایہ دار کے کارخانے کے دُور کش کی داستانوں کی طرح اس کی مظلومی۔ بے بسی بیچارگی، زیردستی

اور فاقہ مستی کے افسانوں کا بیان کافی ہے۔ انہیں تو ایک راستے کی ضرورت ہے۔ ایک منزل ایک نصب العین کی تڑپ ہے۔ تو آپ کو اپنے پاؤں کی طرف نہیں۔ بالائے سر دیکھنا ہوگا۔ پستی سے بلندی کا رخ کرنا ہوگا۔ اب کہ مادّی انسان عادی ارض پر قناعت نہیں کر سکا۔ مادّی چاند پر پہنچ گیا۔ زمین ہی ایک طرح سے چاند کی طرف بڑھی۔ چاند تو زمین پر نہیں اترا۔ شاعر جس بلندی پر کھڑا ہے۔ اس کا وہیں کھڑے رہنا مناسب ہے۔ اسے نیچے نہیں کھینچئے۔ اس میں زندگی کا مستقبل ہے۔ اسی میں آبروئے انام۔

البتہ ایک گذارش ہے۔ خالد اگر اپنے ہر مجموعۂ کلام پر ایک مقدمے کا اضافہ کر دیں۔ تو اس سے ان کی شاعری پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ جیسے شا کی ڈرمانویسی کی عظمت پر۔ شا نے بھی تو اپنے ہر ڈرامے سے پہلے ایک مقدمے کا اضافہ کیا۔

آخر میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ خالد کی شاعری بقول ان کے دوست کے اگر صحیح مقام پر آ گئی تو یہ اس کا بہت بڑا مقام ہے۔ لیکن سردست ذاتِ انسانی، اس کی سیرت اور شخصیت ہی پر اس کی توجہ ہے۔ جس کا وہ طرح طرح سے اظہار کرتا ہے۔ لیکن خالد ابھی مرحلۂ راہ میں ہے۔ ان کی شاعری کے کئی اور مقامات بھی ہیں۔ ہم انتظار کریں گے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

صاحبِ جمال و جلال: عبدالعزیز خالدؔ

ایک خوبرو، خوش پوش اور خوش خصال انسان۔ لبوں پر تبسم اور دل میں دردِ انسانیت اور رموزِ زندگی سے آشنا کلام میں جلال کی فراوانی، سینہ محبتِ رسول سے معمور و منور، آدابِ خود آگاہی سے واقف اور رموزِ زندگی سے آشنا۔ گفتگو میں سادہ اور سہل لیکن شعر میں جلیل و مشکل پسند۔ یہ اس شاعر کا مکمل خاکہ ہے جو دنیائے شعر و ادب میں عبدالعزیز خالدؔ کے نام سے معروف ہے اور آج کل شہرت کے پروں پر اُڑ رہا ہے۔

خالد کا کلام پڑھ کر میرا پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کوہستانی ندی کی طرح ہے جو فرازِ کوہ سے اس قدر زور شور سے بہتی ہو کہ اس آواز میں بلند آہنگ غنائیت، اور اس کا منظر رنگِ جلال سے مزین ہو۔ سُر ہلکے ہوں تو ان میں رنگِ جمال اور بھاری ہوں تو ان میں رنگِ جلال زیادہ ہوتا ہے لیکن جمالیاتی حظ دونوں سے ملتا ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ سُر ہی جمالیاتی حظ کا منبع ہے۔ خالد کا شعر چونکہ سُر میں ہوتا ہے، اس لیے اس سے جمالیاتی حظ ملتا ہے اور خوب ملتا ہے۔ بعض لوگ خوش گلو تو ہوتے ہیں لیکن انہیں سُر تال کا علم نہیں ہوتا۔ البتہ وہ سُریلے نغموں کی نقل اُتارنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو خوش گلو یا سُریلے بھی ہوتے ہیں اور سُر تال کا علم بھی رکھتے ہیں مغنّی یا مطرب کہلاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خالدؔ کے شعروں میں روحِ مغنّی پائی جاتی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ اشعار میں شعریت و غنائیت کا امتزاج حسین و موزوں ہو تو اس کے لیے کلامِ خالدؔ کی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔

میرے لیے خالد کی شاعری ایک وسیع و عریض گلستان کی طرح ہے، جس میں کوہستانی ندیوں کے بلند آہنگ نغمے بھی ہیں اور آہستہ خرام نہروں کے دھیمے سریلے آہنگ بھی۔ اس میں بلبل کے محبت بھرے گیت بھی ہیں اور قمری کے دلدوز نالے بھی۔ یہاں طاؤسِ شعر کا رقصِ مستانہ بھی ہے اور پروانۂ معانی کا رقصِ بسمل بھی۔ اس میں پھول، کلیاں، سبزہ اور نورستہ ثمر سب ہی تمثیلِ حیات کے زندہ و جاذبِ نظر کردار ہیں۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خالدؔ کے پاس الفاظ و معانی کا ایک لشکرِ جرار ہے، جو اس کے ایک اشارے پر حرکت میں آ جاتا ہے۔ اور الفاظ و معانی کے لشکری ہر لحظہ نئی سے نئی شان میں جلوہ گر و گامزن ہوتے رہتے ہیں۔

خالد دنیائے شعر کا مصور اور شوخ و عمیق رنگوں کا دلدادہ ہے، اس کے شعر کی کینوس بڑی وسیع ہے جس میں نقوش و بیز، گہرے، شوخ اور نظر افروز ہیں۔ ان نقوش میں اس قدر تنوع و بوقلمونی ہے کہ عام نظر عموماً حریفِ نظارہ نہیں ہوتی۔ اہل نقد و نظر یہ سوال پوچھا کرتے ہیں کہ خالد کے کلام میں رنگ جلال کیوں اس قدر گہرا اور شوخ ہے، حالانکہ اس کی اپنی شخصیت میں جلال سے زیادہ جمال پایا جاتا ہے؟ میرے نزدیک اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ فطرت کے جلال سے زیادہ متاثر ہے۔ اس کی دوسری وجہ اس کا ذوقِ عربیت ہے۔ عربی زبان نے صحرا کے آغوشِ جلالت مآب میں نشو و نما پائی ہے۔ اس لیے اس میں جلال زیادہ ہے۔ خالد چونکہ اپنے ذوقِ عربیت کی وجہ سے کثرت سے عربی الفاظ و تلمیحات استعمال کرتا ہے۔ اس لیے اس کے کلام میں عربی زبان کا جلال و شکوہ پایا جاتا ہے۔

اُس نے اردو کو عربی کا حسنِ معانی، رنگِ بلاغت اور شکوہِ صحرائی دیا ہے اور اس کے دامن کو صحرا کی طرح وسیع کر دیا ہے اُس کے کلام میں لغت و معانی کی کثرت نہیں بلکہ تخیل و تصور اور استعارہ و کنایہ کی بھی فراوانی ہے، اور اس کثرت و فراوانی میں بوقلمونی و موزونی بھی ہے۔ جس طرح شہد میں طرح طرح کے پھلوں کا رس، خوشبو اور تاثیر ہوتی ہے۔ اس طرح خالد کی شاعری میں عربی، عبرانی، فارسی، ہندی، نیز کئی یورپی زبانوں کے الفاظ، محاورے استعارے، تشبیہات و تلمیحات اور ان کے شعرا و مفکرین کے افکار و تصورات اور جذبات و عواطف کا رنگ اور رس بھی پایا جاتا ہے۔ اُس کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُس میں ڈرامائی عنصر بھی ہوتا ہے، جو شعریت و غنائیت میں جذب ہو کر اُسے چیزے منفرد و دلکش بنا دیتا ہے۔

میرے نزدیک خالد کی شاعری کی ایک از بس اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے شعر و ادب کی اسلامی روایات کا، جن کا یہ دورِ منکر اور ان سے نا آشنا ہے، احیا کرنے کی ایک موثر انداز میں کوشش کی ہے۔ وہ عشق و محبت، وصال و فراق، عشوہ و غمزہ کی جو بات بھی کہنا چاہتا ہے، کہہ دیتا ہے، لیکن ایسے جمالیاتی اسلوب میں کہ ذوقِ سلیم پر اُس کی کوئی بات گراں نہیں گذرتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی جمالیاتی حس زندہ و بیدار رہتی ہے، جسے جنسی جذبے کی لوریاں سلا نہیں سکتیں۔

طبع موزوں میں شعر ڈھلنا اور تخلیقی لمحات میں ایک الہامی جست کے ساتھ بمعرضِ اظہار میں آتا ہے۔ اور موزونیِ طبع ہی کا دوسرا نام سُر ہے۔ سُر آواز میں ہو تو غنائیت، الوان و خطوط میں ہو تو تصویریت اور الفاظ میں ہو تو شعریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سُر دراصل سرِ حسن ہے۔ اور حسن کی صور و اشکال اور انداز و رنگ ان گنت ہیں۔ کسی حسین شے میں لطافت و نزاکت کا عنصر غالب ہو تو اُسے جمال۔ اور ہیبت و جبروت کا عنصر حاوی ہو تو اُسے جلال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تخلیقِ جمیل ہو یا جلیل اس میں "سُر" کا ہونا ناگزیر ہے، کیونکہ وہ سرِ حسن ہے۔ آواز کتنی ہی شیریں کیوں نہ ہو

اگر سُر ہی نہیں تو وہ نغمگی، موسیقیت یا طرب پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح الفاظ کتنے ہی شیریں کیوں نہ ہوں، اگر وہ سُر میں نہیں تو شعر نہیں بن سکتے اور نہ شعریت ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ جس طرح آواز صوتی سانچے میں ڈھل کر نکلتی ہے، اور سانچے کے مطابق شیریں یا ناگوار، ہلکی یا بھاری، کرخت یا لطیف ہوتی ہے، اسی طرح شاعر کے الفاظ اُس کے ذوقِ شعر کے سانچے میں ڈھل کر نکلتے ہیں۔ اور ان کی نوعیت بھی اس سانچے کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خالد کا ذوقِ شعر عربیت کے سانچے میں ڈھلا ہے تو یہ مبالغہ نہیں اعترافِ حقیقت ہوگا۔ اور اس سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیوں اس کی شاعری رنگِ عربیت سے مزیّن ہے۔ یا اس رنگِ عربیت سے وہ طبائع یقیناً نامانوس میں، اور انہیں ایسا ہونا بھی چاہیئے جو ذوقِ قرآن ذوقِ عربیت نہیں رکھتے۔

بات دراصل یہ ہے کہ خالد کو اپنے حقیقی الٰہ (معبود و مسجود اور مطلوب و مقصود) کے محبوب اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عشق ہے، جن کی زبان عربی ہے۔ لیکن وہ ان اہلِ محبت میں سے نہیں ہیں جو یہ کہہ کر اپنے "کم آشنا دلوں کو جھوٹی تسلی دیا کرتے ہیں کہ "یارمن ترکی و من ترکی ندانم" اُسے اپنے "معروضِ محبت" کی زبان کا علم ہی نہیں، ذوق بھی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُس کی نعتیہ شاعری نہ صرف عشقِ رسولؐ کی بلکہ آپ کی زبانِ عربی کی محبت اور ذوقِ عربیت کی بھی آئینہ دار ہے۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خالد کے معروضِ محبت ہیں۔ اس لیے اس کے معروضِ شعر بھی ہیں، اور خالد کا یہ امتیازی وصف ہے کہ وہ اپنے معروضِ محبت کو اُن الفاظ کے پیکر میں پیش کرتا ہے، جو آپ اپنی ذات کے اظہار کے لیے استعمال فرماتے تھے۔ خالد جب اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتا ہے تو معروضِ محبت کی زبان کا اُس حد تک استعمال کرتا ہے، جس تک اُس کی اپنی زبان ساتھ دے سکتی ہے۔ اس طرح اس نے اردو کی نعتیہ شاعری کو محبت کا ایک نیا اسلوب اور عقیدت کا ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ اہلِ مہر و وفا کے لیے یہ اندازِ محبت دلکش بھی ہے اور تاثر کا مبدأ بھی یہ اُن کے ذوقِ حُسن و محبت کی تسکین کا سامان بھی ہے اور ان کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی۔

حاصلِ کلام یہ کہ خالد نے اردو زبان اور زبانِ شعر دونوں کی ثروت میں گراں بہا اضافہ کیا ہے، اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے، جو اس کی عبقریت کی ایک دلیل ہے۔ خالد حقیقتاً عبقری اور اسلامی ادبی روایات کا علمبردار ہے۔ اُس نے اُردو شاعری کو ذوقِ عربیت دیا اور اس کے ذوق میں پاکیزگی کے عنصر کا اضافہ کیا ہے۔

خالد کی شعری تخلیقات کی تعداد تین درجن کے قریب ہے اور "آمد" کا دریا اُسی طرح موجزن ہے، پھر یہ زندۂ جاوید شاعر ابھی جوان ہے، نیز اس کی محبت و ہمت، فکر و خیال اور جذبہ و ولولہ جوان بلکہ نوجوان ہیں۔ یہ اُس پر فضلِ رحمٰن ہے۔ اس لیے کہ اُس کا دل "محبوبِ رحمانی" کی محبت و عقیدت سے معمور و منوّر اور اس کا قلم اُن کے اظہار و بیان کے لیے وقف ہے۔

عشرت رحمانی

عبدالعزیز خالد

ان کا ہر شعر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عقیدت کا آئینہ دار ہوتا ہے

برادرم مکرّم عبدالعزیز خالد ۱۵ جنوری ۱۹۸۶ء کو بفضل تعالیٰ صحت و سلامتی کے ساتھ اپنی عمر کے ساٹھ سال مکمّل کر کے اعزاز و احترام سے اپنے عہدے انکم ٹیکس کمشنری سے ریٹائر ہو گئے۔

یہ خبر اچھی ہے! اور یہ خبر بُری بھی ہے! اچھی اس اعتبار سے کہ خالد صاحب نے اپنے دورِ منصب میں نہایت انصاف و خلوص اور دیانت سے فرائض جلیلہ انجام دیئے۔ ترقیاں کیں اور خوش اسلوبی و اعلیٰ کارپردازی سے اپنی مدّت ملازمت کی تکمیل کر کے نیک نامی اور شاندار کامرانی سے اپنے عہدے سے دستبردار ہوئے، مبارک ہیں وہ سرکاری حکّام اور عہدیدار جو اس طرح کامیابی اور اعتماد کے ساتھ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوں کہ ان کے محکمہ کے حکّام بالا اور ماتحت اور متعلقہ حاجتمند ان کی ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی جدائی سے مغموم ہوں ان کی کمی محسوس کریں ان کے رخصت ہونے کے بعد یاد کیا کریں، خالد صاحب ان خوش نصیب افسروں میں ایک ممتاز افسر ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے احباب و اعزّاء اور خود ان کے لیئے یہ خبر اچھی اور نیک ہے۔

بُری ہے اس لحاظ سے کہ اہلِ معاملہ اور حاجتمندان کی دیانت اور منصفانہ و غیر جانبدارانہ فیصلوں سے محروم ہوں گے۔ ان کی عدم موجودگی میں ممکن ہے۔ اپنے معاملات کے سلسلے میں سماعت اور فیصلوں میں تاخیر اور حسبِ منشا انصاف اور دیانت سے محروم ہیں۔

عبدالعزیز خالد۔ آج کی افسر شاہی کے ایک اعلیٰ رکن ہیں۔ لیکن ان کے منصفانہ خلوص اور صداقت، رواداری اور بے لوثی و بے ریائی کو دیکھ کر اسلامی مملکت کے عہدِ سلف کی یاد تازہ ہو جاتی۔

موجودہ دور کے ایک ادنیٰ افسر کے بابِ عالی پر پہریدار تعینات۔ کسی اہلِ حاجت کو دور سے آتا دیکھ کر "ہوشیار، خبردار، باادب باملاحظہ کا اشارہ کرتا اور چنا نا نظر آتا ہے، کہ "یہ ایک اصلی تے وڈّے حاکم کا ایوانِ معلیّٰ ہے" یہاں پہرے دار کو نذرانہ

پیش کئے بغیر اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور کسی اعلیٰ افسر یا حاکم تک باریابی کوہِ طور کی چوٹی کی سر کرنے سے کم نہیں۔ صاحب بہادر! صاحب بہادر، اکثر و بیشتر میٹنگ میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ میٹنگ چند آس پاس کے حکّام کی چائے نوشی اور گپ بازی پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کے بابِ عالی پر کسی غیر کو کھڑے ہونے کی اجازت کے لئے پہریدار کو نذرانہ پیش کرنا لازمی ہوتا ہے۔

مگر عبدالعزیز خالد۔ کے سیدھے سادہ دفتر کا دروازہ ہر وقت عام و خاص حاجتمند کے لئے کھلا نظر آتا رہا۔ پہرے چوکی کا نام و نشان نہیں۔ دروازہ پر صرف ایک ہلکا سا پردہ اس غرض سے پڑا رہتا کہ باہر کی چہل پہل سے اندر کمرے میں ہونے والی ضروری کارروائی میں خلل نہ آنے پائے اور حاجتمند اپنی حاجت بر آری میں۔ آسانی (بلا تاخیر) حاصل کر سکیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خالد صاحب کے ماتحت افسر اور اہل کار بھی بغیر کسی بدعنوانی و تاخیر اپنے منصبی فرائض بر وقت و بآسانی انجام دیتے رہتے۔ خالد صاحب کے ماتحت عملے کے ساتھ خوشگوار تعلقات یگانگت ہمدردی و خلوص کے اثر سے متاثر ہو کر تمام اعلیٰ و ادنیٰ اہل کار اہلِ معاملہ کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھتے اور امورِ متعلقہ میں غیر ضروری تاخیر یا بے توجہی کا رویہ اختیار نہ کرتے۔ ایسی مثالیں جو خالد صاحب نے اپنے دور میں قائم کیں آج کل شاذ و نادر پائی جاتی ہیں چنانچہ ان ہی باتوں کو یاد کر کے لوگ خالد صاحب کے ریٹائرمنٹ کی خبر کو بری جانتے ہیں خالد صاحب کا ایک کمال یہ تھا کہ وہ بیک وقت دفتر میں آنے والے احباب سے ادبی گفتگو بھی کرتے جاتے اور فائلیں نمٹاتے ساتھ ساتھ ماتحت ارکان کو ہدایات بھی دیتے رہتے۔ خالد صاحب نہایت مخلص، خوش اخلاق بذلہ سنج۔ مہذّب اور دیانتدار انسان ہیں۔ ظاہرداری منافقت اور ریاکاری، حسد و بے جا فخر سے انہیں نفرت ہے نام نہاد کٹ ملائیت سے بھی وہ سخت بیزار ہیں۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ خالد صاحب سے میری کس زمانہ میں ملاقات اور کیسے، کیوں ہوئی تھی یعنی کس محفل میں اور کس سن میں ہوئی۔ البتہ یہ یاد ہے کہ جب میں کراچی میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹریٹ جنرل میں ریڈیو مطبوعات کا مدیرِ اعلیٰ تھا اس وقت کہیں ہوئی تھی اور یہ زمانہ ١٩٥٠ء کا تھا۔ گویا اس حساب سے تقریباً ٣٠ سال سے دوستی ہے۔ مگر اب یہ تعلقات یگانگت اس حد میں ہیں کہ ان کے خلوص و حسنِ اخلاق کے اعتبار سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں انہیں ہمیشہ صرف جانتا ہی نہیں بلکہ خلوص و مؤدّت کے رشتہ اخوّت میں ہم دونوں سدا سے منسلک رہے ہیں اور بے تکلفی و خلوص میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

خالد صاحب نہایت خوش طبع اور دلچسپ دوست ہیں اور نہایت ہمدرد۔ احباب کے دکھ درد کو وہ اپنا درد سمجھتے ہیں۔ معمولی واقف کار کی پریشانی سے انہیں تشویش اور ہمدردی ہوتی ہے شعر و ادب میں عموماً وہ ہر صنف میں کہتے ہیں لیکن حمد، نعت اور منقبت سے ان کو قلبی شغف ہے نعتِ رسول مقبول میں خالد صاحب کو خاقان الپاکستان کہنا بجا ہے کیونکہ نعت گوئی کے دوران عشقِ رسول سے سرشار ہوتے ہیں اور ان کا ہر شعر عقیدت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصّہ نعت پر مشتمل ہے اس کے بعد حمد و منقبت اور دیگر موضوعات پر۔

جہاں تک صنفِ شاعری کا تعلق ہے زبان دل آویز ہوتی ہے اور اردو شاعری تو خصوصاً دلکشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی

ہر شاعر اپنا ایک مخصوص اسلوب رکھتا ہے لیکن اُردو شعراء کے اسالیب اپنے اور جدت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں شاعر ہو یا نثر نگار ادیب ہو یا انشا پرداز، سب کے نطق کلام اور اسالیب بیان کا ایک مخصوص و جداگانہ مرکز ہوتا ہے اسی میں وہ ترقی کرتے ہیں یہیں سے وہ فروغ حاصل کرتے ہیں اور یہی ان کے عروج وارتقاء کا سرچشمہ ہوتا ہے اردو شعراء کی فہرست غیر معمولی طور پر طویل ہے شب فراق سے زیادہ دراز اور زلف پیچاں سے زیادہ طویل۔ تاہم شعراء کی اس کثرت نے اردو زبان کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا۔ اس میں وسعت پیدا کی، تنوع، لچک اور گہرائی پیدا کی۔ اسی باعث اردو زبان کو نئے نئے محاورے ملے۔ نئی نئی دلآویز دل کش تراکیب اور نت نئی لفظی تراش خراش عالم وجود میں آئیں نئے نئے خیالات پران چڑھے زبان کو حسن بیان اور حسن بیان کی خوبیاں ملیں۔ نطق و کلام میں زور دار جوش پیدا ہوا۔ جدید اسالیب ابھرے نئے نئے انداز بیان نمایاں ہوئے ادا سے مطالبہ کی پر کیف و خوش ادا صورتیں دنیائے تخیل سے صفحہ قرطاس پر منتقل ہوئیں اُردو دراصل بجائے خود کوئی زبان زبان نہیں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں کے میل جول سے وجود میں آئی اور مختلف شعرائے قدیم و جدید نے اپنی علمی و ادبی قابلیت اور جدت فکر و طبع سے اس کی ترقی و وسعت میں حصہ لیا اردو میں شعر و سخن کی زبان کا جہاں تک تعلق ہے زیادہ تر اسے عربی فارسی اور ترکی زبانوں نے مالا مال کیا یہی وجہ ہے کہ جو اردو شعراء ان تمام زبانوں پر عبور رکھتے ہیں ان کے ہاں جدت و ندرت اور دلکش الفاظ و تراکیب کا استعمال اور ان کے ذریعہ سے کیف وافر اور فصاحت و بلاغت کا غیر معمولی خزینہ پایا جاتا ہے اگر اردو شاعری میں یہ تنوع نہ ہوتا اور اردو شعراء کی یہ کثرت اور کثرت کے ساتھ علمی وقوف اور ادبی و لغوی ذخیرہ نہ ہوتا تو ان تمام لفظی خوبیوں اور لفظوں سے اردو زبان محروم رہ جاتی۔

اُردو شعراء کی کثرت میں رنگ و اسلوب کی وحدت ایک خصوصیت ہے، یہ چیز اُردو شاعری میں نمایاں نظر آتی ہے۔ یعنی ہر شاعر کا اپنا ایک جدا رنگ اور جدا فنی اسلوب ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف اُردو زبان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے ہر زبان کے شاعروں اور ادیبوں میں یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جو شاعر اپنے مزاج و طبیعت اور علمی حیثیت سے جس رنگ کو قریب و مطابق پاتا ہے اُسے اختیار کرتا ہے۔ اگر اس رنگ سے ہٹتا ہے تو بہک جاتا ہے اس کا سماں اس وقت بندھتا ہے جب وہ اپنے رنگ میں نکھرتا ہے اور اپنی رنگت میں پختگی پیدا کر کے کیف و اثر اور دلکشی کے نغمے الاپتا ہے اور دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ جہاں اپنے طرز و اسلوب سے ہٹا، طلسم ٹوٹا، بات بگڑی، رنگ اُڑا۔

میر کو ارباب نقد و نظر، خدائے سخن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ درد و سوز و گداز وہ لذت حرماں وہ نوائے جگر خراش وہ سرود غم، اشک پیہم، بے کراں غم والم اور یاس و نامرادی جو میر کے اشعار میں ملتی ہے کہیں اور نہیں مل سکتی۔

یہی کیفیت: درد، آتش، ناسخ، غالب اور مومن وغیرہ کی ہے۔ اور یہی بات دور جدید کے شعراء میں بھی مثلاً حسرت موہانی اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، یماب اکبرآبادی اور دوسرے حضرات۔

البتہ اقبال ہر جہتی شاعر ہیں مگر طرز و اسلوب مخصوص ہے۔ اصناف سخن میں رنگا رنگی ضرور پائی جاتی ہے اور جب ہم

خالد کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہی کیفیت اس کے ہاں بھی بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ چونکہ اقبال کی طرح خالد کو بھی عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ اور قرآنِ کریم کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کر کے معانی و مطالب پر فکر و تدبر کیا ہے اس لیے قرآنی لغت جو عام عربی لغت سے بڑی حد تک جُداگانہ ہے۔ اقبال کے مثل خالد نے بھی اس لغت سے آگاہی اور رہنمائی حاصل کی ہے۔

اس اعتبار سے خالد کے اشعار میں خواہ حمد ہو نعت ہو یا منقبت یا اکابرینِ ملت کی مدح و قصائد یا غزل سرائی ہر صنف میں نیا اسلوب و انفرادیت کا رنگ نمایاں ہے۔ ان تمام مختلف و متنوع اصناف اور کیفیات میں وہ فرد نظر آتا ہے۔ اس کی انفرادیت کہیں مجروح نہیں ہونے پاتی۔ اس کا رنگ کہیں نہیں اڑتا اس کا دبدبہ و طنطنہ الفاظ و تراکیب کی حیثیت سے ہر موضوع میں قائم رہتا ہے۔ اس کے پُرشکوہ الفاظ ہر جگہ برقرار نظر آتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ خالد بصارت بھی رکھتا ہے اور بصیرت بھی۔ فراست کا حامل بھی ہے اور ذہانت و ذکاوت کا بھی۔ وہ دور اندیش بھی اور نزدیک بین بھی اس کے پاس قرآنی لغات کا جو غیر معمولی لفظی ذخیرہ ہے۔ اس نے اسے یہ قدرت بخشی ہے جیسے جوہری جس کی کارگاہ سے ہیرا ترش ترشا کر نئے آب و رنگ اور شانِ جمال کے ساتھ گاہکوں کے ہاتھ میں جانے کو دکان پر پہنچا ہے۔ وہ حمد و نعت گوئی میں عموماً قرآنی لغات ہی نہیں بلکہ قرآنی آیاتِ کریمہ سے بھی رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے قرآنِ کریم کا منظوم غیر مقفّٰی ترجمہ اس حسن و خوبی اور ایمان افروز اسلوب و روح پرور انداز سے کیا ہے کہ احکام الٰہی و ارشاد باری کے مطالب و معانی میں سرمو فرق نہیں آنے پاتا۔ جبکہ علامہ سیماب، اکبر آبادی۔ آغا شاعر قزلباش اور بعض دیگر شعراء نے بھی کیا ہے۔ مگر ان حضرات نے شعری ضرورت کے تحت معنوی لحاظ سے تحریف کی ہے۔ جو غیر مناسب ہے اور ان کے ہاں الفاظ و ترکیب میں بھی مخصوص قرآنی لغات کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ خصوصیت سے خالد نے نعتیہ قصائد میں جہاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور صفات و فضائل مبارکہ بیان کئے ہیں وہ قرآنِ کریم کی آیاتِ کریمہ کے اقتباس ہیں جو اللہ جل شانہٗ نے اپنے حبیب پاک صلوٰۃ و تسلیم کی شانِ اقدس میں خود ارشاد فرمائے ہیں۔

خالد صاحب کے نعتیہ کلام کے حسبِ ذیل مجموعے زیادہ معروف ہیں۔

۱۔ فارقلیطؐ ۲۔ منحمنّاؐ ۳۔ ماذماذؐ ۴۔ طاب طابؐ ۵۔ حمطایاؐ ۶۔ عبدہٗ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اسماءِ مبارک انجیل و تورات میں آئے ہیں۔

ان کی غزلیات کا مجموعہ "حدیثِ خواب" گزشتہ سال شائع ہو رہا ہے جو بہت مشہور و مقبول ہے۔ خالد صاحب جاپانی، سنسکرت اور ہندی زبانوں پر بھی کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مہابھارت کو منظوم ترجمہ "مہابھارت کتھن مالا" کے نام سے نہایت خوبی سے کر ڈالا جو شائع ہو چکی ہے۔ جاپانی نظموں کا منظوم ترجمہ اور بعض چینی نظموں کا آزاد ترجمہ ترجمہ بہت دل پذیر اسلوب سے کیا ہے۔

قرآن کریم کا منظوم ترجمہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ،"فرقانِ جاوید" کے نام سے کیا ہے۔ اس ترجمہ کے اقتباسات "قومی ڈائجسٹ" اور ماہنامہ "تہذیبِ اخلاق" میں بالالتزام ہر ماہ شائع ہو رہے ہیں۔ خالد صاحب کی نثر کا اسلوب بھی شاعرانہ اور فصیح و سلیس ہے۔ ادبی نقاد کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور عملی تنقید کے فن پر انہیں بلند نظری کے اعتبار سے کافی دسترس حاصل ہے۔ ان مطبوعہ تصانیف و تالیفات اور تراجم کی تعداد جو مجموعی طور پر وقیع و بلند پایہ ہیں تقریباً تین درجن ہو چکی ہے اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ خالد صاحب اپنی غیر معمولی سرکاری مصروفیات اور عبادات و دینی فرائض اولاد کی تعلیم و تربیت اور احباب سے ملنے جلنے، نیز علمی ادبی مجالس میں شرکت کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ اتنا وقت شعر و سخن اور تصانیف کی (جو ہر ایک قابلِ دادِ تحسین ہے) سرگرمیوں کے لئے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یا تو وہ دن رات جاگتے رہتے ہیں اور اگر سوتے ہیں تو شاید دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے خالد صاحب کے علاوہ موجودہ زمانہ میں، میں نے صرف دو احباب کو اس طرح کی دینی، علمی و ادبی سرگرمیوں میں شب و روز مصروف دیکھا ہے۔ ایک محترمی حکیم محمد سعید (ہمدرد) اور دوسرے ان کے برادر محترم الحاج حافظ حکیم عبدالحمید (ہمدرد مقیم دہلی) اور یہ دونوں حضرات شب و روز میں صرف تین گھنٹے سوتے ہیں اور ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ناغہ کرتے ہیں صرف رات کو کھانا کھاتے ہیں۔ غالباً کچھ یہی کیفیت خالد صاحب کی بھی ہے۔ اگرچہ مجھے بھی ان سے یہ تصدیق کرنے کا موقع نہیں ملا۔ خالد صاحب کی مختلف صفات میں ان کی زندگی کی خصوصیات خاصہ میں ہر اعتبار سے لفظ خوش، نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی

وہ خوش وضع، خوش شکل، خوش لباس ہیں خوش بیاں و خوش نوا، خوش طبع، خوش گمان، خوش عقیدہ، خوش اخلاق ہیں۔ خوش خو، خوش گفتار اور خوش خط ہونے کے باعث خوش بخت اور خوشیوں کا سرچشمہ ہیں۔ یہ ایک سچے دیندار و متقی مومن کی صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حقیقی محبت اور عشقِ رسولؐ کے صلے میں عطا فرمائی ہیں۔ گویا اللہ جل شانہ نے بطفیل حبیب پاکؐ خالد کی یہ دعا قبول فرمائی ہے ؎

ہو میسّر ترے دم سے مجھ کو چشمِ بینائے فرزند آذر
نطقِ حسّانؓ و سوزِ بصیریؒ جذبِ سلمانؓ و فقرِ ابوذرؓ
میرے اشعار سرمایہ میرا ہو پذیرا یہ نذرِ محقّر

درحقیقت ؎

دولتِ بیدار خالد کو ملی
ہر خوشی سے ان کی جھولی بھر گئی

ارشاد احمد حقانی

عبدالعزیز خالد ـــــ منفرد کردار اور منفرد شخصیت

کسی ماہر نفسیات نے شخصیت کی ان الفاظ میں کی ہے ۔"
Personality is changelessness in change

جناب عبدالعزیز خالد کی شخصیت اور مزاج و کردار کے طویل مشاہدہ و مطالعہ نے مجھ پر اس تعریف کی صداقت اچھی طرح واضح کر دی ہے ۔ آج ان کی شخصیت کی جو خصوصیات زیادہ اجاگر ہو چکی ہیں ۔ اور جو ان کے جاننے والوں اور ان پر لکھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں ۔ زمانہ طالب علمی کے آغاز ہی سے وہ سب کی سب ان میں موجود تھیں ۔ اور ان کی کارفرمائی ان کی زندگی کے ہر ہر مرحلے میں یکساں طور پر نظر آتی ہیں ۔ آج ہر شخص ان کی وسعتِ مطالعہ ، ان کی عرق ریزی ، ان کے علمی ذوق و شوق سے واقف اور اس کا قائل و معترف ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام اوصاف ہمیشہ سے ان کے کردار اور شخصیت کا لازمی جزو رہے ہیں ۔ سکول اور کالج کے زمانہ میں وہ سب سے زیادہ پڑھنے والے سب سے محنتی طالب علم رہے ہیں ۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں انہیں بچپن ہی میں پڑھائی کی چیٹک لگ گئی تھی اور کتابیں ان کی سہیم و ندیم رہی ہیں ۔ گزشتہ تیس سال سے خالد کی جو تصویر میرے دماغ میں محفوظ ہے ۔ اس کے بعض خدوخال میں جزوی ردوبدل بھی ہوا ہے ۔ لیکن کتاب ، شعر اور ذوقِ علمی اس کے ایسے اجزاء ہیں جو کسی بھی دور میں اس سے الگ نہیں ہوئے ۔ کالج کے زمانہ میں خالد ان معنوں میں ایک کتابی طالب علم تھا اس کا اوڑھنا بچھونا کتاب تھی ۔ آج بھی جب کہ وہ ایک سرکاری ملازم ہے اور فائلوں کی ورق گردانی سے تھک ہار کر گھر لوٹتا ہے ۔ اس کی تفریح اور اس کا مشغلہ کتب بینی ہی ہے اس نے کتابیں صرف ڈگری یا ملازمت حاصل کرنے کے لیے نہیں پڑھیں اور بہت سے طالب علم افراد اور سرکاری افسروں کی اکثریت کی طرح کتابوں سے ان کی محبت حصول ملازمت کے بعد ختم نہیں ہو گئی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے ۔ وہ اب بھی اکثر اوقات مجھ سے کہتا ہے کہ میرا دل فی الحقیقت کسی کام میں لگتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کتابیں پڑھی جائیں ، کتابیں لکھی جائیں ۔ وہ شائع ہوں ۔ ان پر گفتگوئیں اور تبصرے ہوں اور اس طرح مزید کام کے لیے آمادگی اور فضا پیدا ہو ، کتاب سے اس کا عشق خالد کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے اور میں کتاب کے بغیر خالد کا تصور نہیں کر سکتا ۔ حد یہ ہے کہ خالد سالہا سال سے اپنے مطالعہ کے کمرے میں ہی سوتا ہے اور موسم گرما و سرما میں اس کا یہی معمول ہے ۔ ابھی چند ہفتے پہلے اس کے دوست نے جو ایک مرکزی وزیر بھی ہیں اس کی لائبریری دیکھ کر اس کی تعریف کی لیکن وہ یہ سن کر حیران رہ گئے کہ خالد رات کو بھی لائبریری میں سوتا ہے انہوں نے کہا مجھے بتایا گیا ہے کہ لائبریری میں سونا صحت کے لئے نقصان دہ ہے ۔ خالد نے جواب دیا ہو سکتا ہے یہ ٹھیک ہو لیکن میرا خیال ہے اس عادت نے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ مجھ پر اس کا کچھ اچھا ہی اثر پڑا ہو ۔

مجھے خالد کی یہ بات درست ہی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ کتاب سے اس کو جو قلبی تعلق ہے اس کی وجہ سے لائبریری ہی میں اس کا فطری مقام ہے آپ اسے کتابوں کی دنیا سے دور کر دیجئے وہ مرجھا جائے گا، اس کی زندگی میں ایک ایسا خلا آجائے گا جس کو کوئی دوسری مصروفیت کوئی دوسری دلچسپی، کوئی دوسری تفریح پُر نہیں کر سکے گی۔

یہ کہنے کی تو غالباً ضرورت نہیں کہ کتاب سے خالد کا شغف نمائشی، سطحی، شوقیہ یا بطور فیشن نہیں۔ جیسا کہ بعض نام نہاد کتاب دوستوں کا ہوتا ہے۔ کتاب سے اس کا شغف عشق کی حد تک ہے۔ اور وہ کتابوں کو پڑھتا نہیں انھیں چاٹتا ہے اور مضم کرتا ہے۔ میں نے خالد سے زیادہ کتاب بیں آج تک نہیں دیکھا اور یہ یاد رکھیئے کہ اس کی تیز رفتاری اس کے فہم کتاب میں حائل نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ سے ہوتی ہے۔ وہ کتاب کے کسی حصّے کو نہ سمجھے تو کبھی آگے نہ بڑھے لیکن چونکہ تفہیم بالعموم اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتی اس لئے وہ اپنی تیز رفتاری برقرار رکھ سکتا ہے۔ خالد کی کتاب بینی اور کتاب دوستی کی یہ خصوصیت اس وقت بھی پورے عروج پر تھی جب وہ سالِ اوّل کا طالب علم تھا یہ شاید محض اتفاق نہیں کہ میری اور اس کی پہلی ملاقات کالج کی لائبریری میں ہوئی تھی۔ اس کے لیے کالج میں یہی سب سے فطری جگہ تھی۔ جہاں باقاعدگی سے جانا اس کا معمول تھا۔

کالج کے زمانہ طالب علمی کا دوسرا تاثر جو میرے ذہن میں نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ خالد اپنے اساتذہ سے کلاس روم سے باہر بھی اکثر ملتا تھا اور ان سے اس کے تعلقات دوستانہ اور بہت حد تک مساویانہ تھے۔ اصل میں اس کیفیت کا سبب یہ ہے کہ خالد ہمیشہ علمی لحاظ سے اپنے سے بلند تر افراد سے ملنے کا خواہش مند رہا ہے۔ اور اسے اہلِ علم کی حد تک ماضی یا حال کا ایک بھی صاحبِ علم ایسا نہیں جس کے کمالاتِ علمی کا ذکر خالد نے مرعوبیت کے انداز میں کیا ہو۔ ہر بڑے سے بڑے شخص کے علمی کارناموں کا ذکر پڑھ اور سُن کر اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ان میں کوئی بات ناممکنات کی تعریف میں آنے والی نہیں اور انسان کوشش کرے تو ایسی فضیلتِ علمی حاصل کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی یہ کیفیت کسی ذہنی کبر یا بے خبری اور بے شعوری کا مظہر نہیں بلکہ اس کی ذہنی استعداد اور اپنے علمی امکانات کے احساس کا نتیجہ ہے۔ اس نے اکثر اوقات خود بڑے تعجب سے اپنی اس کیفیت کا اظہار کیا ہے اور مجھ سے پوچھا ہے۔ کہ میری رائے میں وہ آج تک کیوں کسی سے مرعوب نہیں ہوا۔ میرے پاس اس سوال کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں کہ اسے اپنے علمی و ذہنی امکانات کا جو غیر شعوری احساس ہے وہ اسے مرعوبیت سے بچانے کا ذمہ دار ہے۔ میں نے ابھی جو کچھ بیان کیا ہے ممکن ہے بہت سے حضرات کو یہ غیر فطری اور ناممکن معلوم ہو یا وہ اسے خالد کے کسی احساسِ کمتری یا پھر کسی احساسِ برتری کا کرشمہ سمجھیں اور اس کی روشنی میں وہ ان کی تحلیلِ نفسی کی ضرورت محسوس کریں۔ میں ان حضرات کو ایسی کسی قیاس آرائی یا کوشش سے روکنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں نے جو کچھ خالد کی پوری زندگی کے دوران دیکھا ہے اور میرے نزدیک اس کی جو وجہ ہے اسے میں نے بیان کر دیا ہے۔ ممکن ہے کوئی زیادہ باریک بین مبصّر یا ماہر نفسیات کوئی دوسری توجیہہ پیش کر سکے لیکن اسی کوشش کرنے والوں سے میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ وہ اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ خالد کے اندر

طالب علمانہ جستجو اور ذہنی بحر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے اور وہ کسی بھی شخص کی رائے یا علمی کاوش کو کبھی ادنیٰ سے ادنیٰ جذبۂ حقارت سے نہیں دیکھتا۔

خالد کے کردار کی دو اور خصوصیات جو زمانۂ طالبعلمی سے مسلسل نمایاں چلی آ رہی ہیں سیاست اور ہنگامہ آرائی سے دُوری اور مذہب کے ساتھ حقیقی دلچسپی کے باوجود روایتی مذہبی انداز اور طور طریقوں سے اجتناب ہے۔ اسلامیہ کالج میں ہمارے قیام کا زمانہ برصغیر کی سیاست کا انتہائی ہنگامہ پرور دور تھا۔ ہم سال دوم میں تھے۔ جب ۱۹۴۶ء کے عہد ساز انتخابات ہوئے اور پاکستان کا قیام اس وقت ہوا جب ہم بی۔ اے سال اوّل میں تھے۔ اس زمانہ میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ تحریکِ پاکستان کا گڑھ تھا۔ اس کالج کے طلباء نے ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں رات دن کام کیا۔ خود میں متعدّد انتخابی حلقوں میں گیا۔ سیاسی جلوسوں اور جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ لیکن خالد طبعاً ان چیزوں سے دور رہا اور ہنگامہ آرائی کے اس دور میں بھی اپنی کتابوں کی دنیا میں گم رہا۔ اس کی یہ کیفیت آج تک قائم ہے۔ وہ بے تکان اور بے حساب پڑھتا ہے لیکن خالصتاً سیاسی تحریریں بالعموم وہ کوشش کے باوجود نہیں پڑھ سکتا۔ آپ کو تعجب ہو گا کہ خالد جیسا حریص قاری اور کتاب بین کسی بھی اردو یا انگریزی روزنامہ اخبار کا اداریہ بالالتزام نہیں پڑھتا۔ وہ متعدّد اخبارات باقاعدگی سے دیکھتا۔ خبریں اور ادبی کالم پڑھتا ہے اور تمام مکمل اور بین الاقوامی واقعات سے پوری طرح باخبر رہتا ہے لیکن اپنے نتائج خود اخذ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ کبھی ارادے سے ریڈیو نہیں سنتا۔ میں نے نازک سے نازک سیاسی دور میں بھی اسے خبریں سنتے ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا۔ مجھ جیسے آدمی کے لئے جو پنجوقتہ نماز کی طرح پنجوقتہ نیوز بلیٹن سنتا ہے اور جس کے سال میں دو چار نمازوں کی طرح دو جار ہی نیوز بلیٹن قضا ہوتے ہیں خالد کی یہ عادت باعثِ حیرانی ہونا چاہیئے لیکن مجھے اس پر کوئی تعجّب نہیں ہوتا کیونکہ میری دانست میں اس کی دو وجوہات بالکل واضح ہیں۔ اولاً وہ سیاست اور سیاست دانوں کے انداز اور طور طریقوں سے اس قدر نالاں ہے کہ اس کے اندر سیاسی کھیل کے نشیب و فراز سے آگاہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں۔ ثانیاً وہ ادب و فن اور شعر و شاعری دنیا میں اس قدر منہمک ہے کہ کسی دوسری دلچسپی کے لیے اس کے پاس کوئی فرصت نہیں۔ وہ ٹائم، نیوز ویک اور متعدّد دوسرے مغربی رسائل باقاعدگی سے دیکھتا ہے لیکن ان میں بھی اس کی دلچسپی کا اصل میدان سیاسی تحریریں نہیں ہوتیں بلکہ اس کی نظر مغربی اور اشتراکی دنیا کے سماجی حالات اور رجحانات پر رہتی ہے۔

وہ اندر سے ایک شدید مذہبی آدمی ہے اور دین کی روح اس کی شخصیت اور کردار میں اس طرح رچی بسی ہوئی ہے جس طرح پھول میں خوشبو۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ قرآنِ پاک کی باقاعدہ تلاوت اور اس کا مطالعہ پابندی سے کرتا ہے لیکن اس کے ظاہری انداز اور وضع قطع سے آپ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اسے مذہب سے گہری دلچسپی ہو گی اس کا اپنا ایک تصورِ مذہب ہے۔ زندگی اور مذہب کے رشتہ کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیاتِ طیبہ کو وہ ایک خاص زاویہ سے دیکھتا ہے۔ اسے مذہب کے مروّجہ تصوّر اور اکثر اہلِ مذہب کے

طور طریقوں سے شدید اختلاف ہے۔ وہ ان کی اصلاح کا جذبہ بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کرنا چاہتا ہے جو حضورؐ کی شخصیت اور سیرت کو ایک نئے انداز سے سمجھنے میں مدد دے۔ دین سے حقیقی وابستگی لیکن ظاہری رسوم و قیود سے غیر معمولی آزادی خالد کی شخصیت کا ہمیشہ سے جزو رہی ہے اور میں گذشتہ تیس سال سے کسی قابلِ ذکر تغیر کے بغیر اس کیفیت کے تسلسل کا شاہد ہوں۔

خالد اس دور میں مذہب کے بقا اور اس کی خدمت کے طریق کار کے بارے میں بھی ایک رائے رکھتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ رائے زیادہ واضح اور زیادہ پختہ ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن مذہب کے متعلق اس کا ذاتی رویہ ہمیشہ سے ایک جیسا رہا ہے۔ کھیل کود کے بارے میں بھی خالد کا مزاج شروع سے ہی ایک خاص رنگ لئے ہوئے ہے۔ وہ کبھی ایک کھلاڑی نہیں رہا اور کسی گیم میں اس نے دلچسپی نہیں لی۔ اب بھی اس کی یہ حالت ہے کہ کھیلوں کی اہم ترین خبروں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری اس کے ساتھ ملاقات اگر کسی ایسے روز ہو جس سے صرف ایک دن پہلے پاکستان ہاکی کا عالمی چیمپین بن گیا ہو تو بھی ہمارے درمیان اس موضوع پر گفتگو نہ ہو گی۔ کرکٹ کا کوئی بہت ہی دلچسپ اور ہنگامہ پرور میچ ہو رہا ہو اور آپ خالد کے پاس اس کے پانچویں دن کے آخری ایک دو گھنٹوں میں بیٹھے ہوں جبکہ ماہرین کے نزدیک ابھی میچ کا انجام بالکل غیر یقینی ہو تب بھی خالد آپ سے اس موضوع پر مطلقاً کوئی بات نہیں کرے گا اور اس ضمن میں تازہ ترین پوزیشن معلوم کرنے کی کوئی خواہش اس کے اندر نہیں ہو گی۔ بلکہ آپ کسی ایسی خواہش کا اظہار کریں گے تو وہ یہ رائے قائم کرے گا کہ ابھی آپ کے اندر کچھ بچپن باقی ہے۔

خالد کی شخصیت کا ایک اور پہلو جو زمانہ طالب علمی سے نمایاں رہا ہے چھوٹی باتوں سے نفرت اور مادی ضروریات اور دنیاوی معاملات سے عدم دلچسپی ہے۔ خالد کسی بہت زیادہ خوشحال گھرانے سے تعلق نہیں رکھتا۔ کالج کے زمانہ میں بعض اوقات اس کا ہاتھ تنگ بھی رہتا لیکن میں نے کبھی اسے پیسوں کا حساب کرتے یا مالی معاملات کی باریکیوں میں جاتے نہیں دیکھا۔ اس نے کبھی روپے پیسے کے موضوع پر بات نہیں کی اور نہ کبھی یہ ظاہر ہونے دیا کہ اسے کوئی مالی مشکل درپیش ہے۔ وہ ہمیشہ سے ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ معاشرتی ذمہ داریوں کے احساس اور حلال آمدنی پر انحصار کی وجہ سے وہ روپے پیسے کے بارے میں لاپروائی کا رویہ تو اختیار نہیں کر سکتا بلکہ عین ممکن ہے کہ بعض بے خبر لوگ یہ رائے قائم کریں کہ وہ فراخدلی سے خرچ کرنے والا آدمی نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ خالد کے مزاج پر کسی قسم کی خساست کا سایہ بھی نہیں پڑا۔ وہ اندر سے مال و دولت کو اتنی معمولی اور گھٹیا چیز سمجھتا ہے کہ اس کا ذکر بھی اسے پسند نہیں لیکن اس کی اس خصوصیت کو سمجھنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں۔ ریلوے ہوسٹل میں قیام کے دوران میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ ملازم بازار یا ٹک شاپ سے واپس آنے کے بعد حساب کتاب دینا چاہتا تو خالد بڑی بے صبری سے کہتا "بس ٹھیک ہے، جو کچھ ہے رکھ دو"۔ اور کبھی پیسوں کو گننے گنانے کے چکر میں نہ پڑتا تھا۔ آج بھی حقیقتاً روپے پیسے کے بارے میں اس کا اصل رویہ یہی ہے۔ اگرچہ بعض

ظاہر بینوں کے لیے اس چیز کو سمجھنا مشکل ہے۔

زندگی کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں خالد کا رویہ ایسا ہی ہے مثلاً اسے گھریلو انتظام اور مسائل کی تفصیلات کا بالعموم کوئی علم نہیں ہوتا۔ وہ بہت سے ایسے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا جو اکثر لوگوں کی گہری توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ خالد چائے پینا چاہتا تھا۔

وہ باورچی خانہ میں پہنچا لیکن اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ پتی کہاں ہے اور چینی کہاں ہے۔ تلاش کے باوجود یہ چیزیں اسے نہ مل سکیں اور اسے صرف دودھ پر قناعت کرنا پڑی جو اتفاق سے ایک جگہ پر پڑا ہوا مل گیا ورنہ شاید اسے کچھ بھی نہ ملتا۔ خالد کبھی مہینے اپنے کمرے کے علاوہ گھر کے دوسرے حصوں میں نہیں جاتا۔ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی اس لیے کہ شروع ہی سے اسے فن کی دیوی نے اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اور اس کے قلب و ذہن کے ہر گوشے میں اس کی محبت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ خالد چونکہ بڑے کام میں مصروف ہے اس لیے قدرت نے اسے چھوٹے چھوٹے بوجھوں سے ہمیشہ آزاد رکھا ہے۔ اس کی افتادِ طبع ہی ایسی بنائی ہے کہ روزِ اوّل سے وہ ان معاملات سے بالاتر ہے۔ میں جب خالد کی شخصیت کو، ان غیر معمولی اور غیر مبدّل خصوصیات کو دیکھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ قدرت خود شروع سے اس کی راہنمائی اور تربیت کر رہی ہے اور جو کام وہ کر رہا ہے یا آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کے لیے خود ہمیشہ سے اس کی دستگیری کرتی چلی آ رہی ہے۔ مجھے آج سے تیس سال پہلے کے خالد اور آج کے خالد میں شخصیت کے بنیادی اوصاف کے لحاظ سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے کردار کی تعمیر ایسی صحت مند اور مثبت بنیادوں پر ہوئی ہے کہ طویل عرصہ گذرنے کے باوجود انھیں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ارتضیٰ زیدی

عبدالعزیز خالد

عبدالعزیز خالد صاحب کی شخصیت کے متعلق لکھنے تو بیٹھ گیا لیکن نہ میں ان کو صحیح معنوں میں جانتا ہوں، نہ ہی پہچانتا ہوں۔ میرے واسطے تو ان کو جاننا اور ان کو پہچاننا مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ بھی جو ان کو جاننے اور پہچاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، خوش فہمی ہی میں مبتلا ہیں۔ بھلا اتنی تہہ در تہہ شخصیت کے لیے آسانی سے یہ دعوے کیسے کیا جا سکتا ہے معلوم نہیں خالد صاحب واقعی اتنے سیدھے اور سادہ مزاج ہیں جتنے وہ نظر آتے ہیں، یا اتنے ثقیل جتنے وہ اردو انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، یا اتنے گہرے جتنے ان کے خیالات ہیں۔

خالد صاحب کا نام تو میں نے اس وقت ہی سنا تھا جب اسی محکمہ میں داخل ہوا جس میں آج وہ کمشنر ہیں۔ ایک دن ہم نو وارد افراد محکمہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ انکم ٹیکس ایسے خشک محکمہ میں اتنے شاعر مزاج لوگ کیسے آ گئے اور اگر کسی طرح پھنس بھی گئے تو کیوں پھنسے رہے اور کیوں آزاد نہ ہو گئے۔ اس ہی تذکرہ کے دوران جہاں جالبی اور عالی صاحبان کے نام زیر بحث تھے وہاں خالد صاحب کا نام بھی موضوع سخن بنا رہا۔ لیکن خالد صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ انکم ٹیکس کے محکمہ سے چند دنوں کے واسطے باہر ہوا کھانے یا آکسیجن لینے کے لیے باہر نکلے اور بطور ڈپٹی سیکرٹری تعینات ہوئے۔ اس سے پہلے دو چار مرتبہ ان سے ملنے کی ہمت کی لیکن نہ معلوم کیوں ان کے دفتر کے دروازہ سے واپس ہو گیا۔

خالد صاحب سے "کچھ" تفصیلی ملاقات ۱۹۶۲ء میں اس سفر کے دوران ہوئی جو اس وقت کے وزیر خزانہ جناب ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے عوام کی تکلیفات و ضروریات معلوم کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اور اس سفر پر لے جانے والی ریل میں خالد صاحب اور میں ہم سفر تھے۔ اس کے بعد سے گاہے بہ گاہے خالد صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اور جب وہ اسلام آباد آتے ہیں مجھے شرف ملاقات ضرور بخشتے ہیں، میں بھی جب لاہور جاتا ہوں خالد صاحب کو سلام کرنے حاضر ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔

اس سفر کے دوران اور اس کے بعد کی ملاقاتوں میں بھی میں نے خالد صاحب کو اُن خالد صاحب سے بالکل مختلف پایا جن سے میں پہلے مل چکا تھا اور جن کے متعلق میرے ذہن میں "محدود" قسم کا تاثر تھا۔ نہ جانے ذہن پر کب اور کیونکر یہ تاثر بیٹھ گیا تھا کہ یہ تو

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

تسم کی چیز ہوں گے مگر تفصیلی ملاقات کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

ہیں ہیں نے ان کو افسر کے بجائے ایک خدا ترس اور حساس انسان پایا جو عام گفتگو میں ایسے منکسر اور سادہ ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا۔ دنیاداری اور لچھے دار دنیاسازی بہت دور ایک درویش صفت انسان جو یہ تو نہیں کہتا۔

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

لیکن دفتری پلندوں کی مشقت میں نہ صرف مشق سخن جاری رکھتا ہے بلکہ ایسے موتی پروتا ہے کہ شعر دُرِ نایاب معلوم ہوتا ہے لوگ اسے اونچی کرسی پر متمکن علمیت کے غرور میں مخمور ایک اعلیٰ افسر سمجھتے ہوں گے (اور پہلے میں بھی کچھ ایسی بدگمانی کا شکار تھا) لیکن میں نے خالد صاحب کو یادِ خدا میں غرق، بزرگانِ دین کی منقبت میں محو، تاریخ اسلام کی ورق گردانی میں غرقاب اور عقیدتِ دین میں سرشار دیکھا ہے۔ میں نے ان کو قبرستانوں میں فقرا کے مزاروں کو تلاش کر کے ان پہ فاتحہ پڑھتے۔ تعظیماً سر جھکاتے اور ان کی زندگی اور تعلیمات سے اثر لیتے ہوئے دیکھا۔ نہ صرف یہ کہ خانقاہوں اور مزاروں پر ادب سے حاضری دیتے ہیں بلکہ عملی زندگی میں سڑکوں، گلیوں اور کوچوں میں وہاں کی اصل زندگی معلوم کرنے کے لیے پھرتے رہتے ہیں۔ غریبوں سے مزدوروں سے، تانگہ بانوں سے ان کے حالات معلوم کرتے ہیں اور حتی المقدور جو کچھ کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔

خالد صاحب ایک عام افسر کے تصور سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک مرتبہ اسلام آباد ایک میٹنگ کے سلسلہ میں آئے۔ دوپہر میں مجھ سے کہا کہ مری جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ میں نے کہا میرے پاس ڈرائیور نہیں ہے۔ ورنہ گاڑی حاضر ہے۔ کہنے لگے نہیں بس سے جاؤں گا۔ میں نے کہا بہت دیر ہو گئی ہے اس وقت بس سے جا کر رات تک واپس آنا مشکل ہے۔ کہنے لگے اچھا دیکھوں گا۔ اگلے دن جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اسی شام بس سے مری گئے بھی اور واپس آ بھی گئے۔ یہ خالد صاحب کی ہمت تھی کہ بس سے جاتے وقت ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر کریں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کا لوٹتے وقت۔ لیکن اس سے ان کی مستقل مزاجی اور ارادہ کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ مری جانے کی لگن تھی، مری کی مال پر آدھ پون گھنٹہ ٹہلنے کو دل چاہ رہا تھا لہٰذا اگر پیدل بھی جانا پڑتا تو شاید چل پڑتے۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو ذہن میں آ رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک بہت اعلیٰ سطح کی میٹنگ تھی۔ جس میں تقریباً پچیس تیس افسران شامل تھے۔ اس میں انگریزی بولنے کی شرط نہ ہونے کے باوجود شروع سے آخر تک انگریزی ہی انگریزی بولی جا رہی تھی۔ ایسے چند لوگ بھی تھے جو اگر انگریزی نہ بولتے تو شاید اپنی بات اور زیادہ واضح اور احسن طریقہ سے بتا سکتے لیکن پوری میٹنگ میں خالد صاحب واحد شخص نکلے جنہوں نے اُردو میں بات کی۔ معلوم نہیں دوسروں نے کیا سوچا۔ کم سے کم میری نظر میں خالد صاحب کی قدر و عزت کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اگلے دن جب میں نے اس جرأت اور انفرادیت پر مبارکباد

کہاتو کہنے لگے کہ جب ہماری سوچ ہمارے الفاظ، ہماری زبان اپنی نہیں ہوگی ہم کس طرح دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں کئی ممالک کے باشندوں کی مثال دی کہ جاپان کا باشندہ جاپانی بولنے میں شرم محسوس نہیں کرتا، چین کا باشندہ چینی زبان بولنے میں فخر محسوس کرتا ہے ۔ فرانسیسی انگریزی بولنا اپنی ہتک سمجھتا ہے ۔ لیکن پاکستانی اگر انگریزی نہ بولے تو وہ جاہل اور غیر شائستہ سمجھا جاتا ہے ۔ بہت دیر تک افسوس کرتے رہے کہ اٹھائیس انتیس سال ہو گئے انگریزی زبان کی بدولت ہم میں یگانگت پیدا نہ ہوسکی ، ہم میں آپس میں وہ اخوت ، محبت اور بے تکلفی نہ ہوسکی جو اب تک ہو جانی چاہیے تھی ۔ کہنے لگے کہ جب تک ہم انگریزی کی زبان پر فخر کرتے رہیں گے ہم اسلامی تہذیب ، اسلامی تمدن اور اسلامی سبق سیکھنے اور سمجھنے سے قاصر رہیں گے ۔ مرحبا اے عبدالعزیز خالد ۔

زبان کے سلسلہ میں خالد صاحب کی زبان کا ذکر بھی کر دوں ۔ خالد صاحب کی زبان سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اکثر ہکلا کر بولتے ہیں یا ایک بات کو کئی کئی مرتبہ دہراتے ہیں بلکہ یہ کہ اردو شاعری ہو یا انگریزی سرکاری خطوط ، وہ بہت دقیق ، غیر معروف اور "بمباسٹک" (BOMBASTIC) قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ اردو شاعری میں تو الفاظ کیا پورے پورے مصرعے اور اکثر شعر عربی زبان میں ہوتے ہیں ۔ ایک صاحب نے ان کی شاعری کی داد دیتے ہوئے کہا یہ تو بہت پاکیزہ اور "الٰہی" شاعری کرتے ہیں کہ ان کا آدھا کلام تو کلامِ خدا ہوتا ہے ۔ یہی انداز ان کے انگریزی خطوط کا ہے ۔ اگر اردو شاعری میں کلامِ الٰہی ہے تو انگریزی تحریر کیوں پیچھے رہ جائے اس ہی لیے شاید اس میں بائیبل سے انتخاب ہوتا ہوگا ۔

آئیے آخر میں مصطفیٰ زیدی کی بیاض سے عبدالعزیز خالد کے نام کا ایک ورق بھی پڑھ لیں ۔

ثنا جس بُتِ مہ رو کے خالِ ہندو پر	بتانِ کاشی و سلمیٰ رُخانِ فرغانہ
سیاہ چشم و ستارہ جبین و فربہ سُریں	چراغِ بُت کدہ و ساتگینِ مے خانہ
دو گوشے عاج نمودار و سخت و ایستادہ	فروغِ قمقمۂ نور، واہ کیا کہنا
شہاب و شعلہ و سیماب و برق و مقناطیس	ہر انگ جادو ہی، ہر رنگ سحر کارانہ
وہی کلیجۂ زہرہ نگاہ و آہو چشم	بنی بہ جبرِ زمانہ ـــ متاعِ بیگانہ
نقابِ رُخ سے ہٹا کے لٹوں کو جھٹکا کے	حریمِ وصل میں آئی تھی ماہِ تابانہ !
سلونے روپ کی لوباس کر گئی ہجرت	جلا وطن ہوئے سپنے، لٹا پری خانہ
عذاب ہے غمِ دوری و دردِ مہجوری	کہیں سے تابِ صبوری ملے تو بتلانا
وصالِ یک دو نفس کی سزا فراقِ دوام	الٰہی ہو تو بہ قدرِ خطا ہو جرمانہ
مری متاع ہے سوز و گدازِ پنہانی	فغانِ بے اثر و نالۂ فقیرانہ

(مصطفیٰ زیدی مرحوم کی بیاض کا ایک ورق)

شریف رزمی

عبدالعزیز خالد ـــــ ایک مطالعہ

یہ صرف جدید اردو شاعری کا ہی نہیں اس دور کے پورے ادب کا المیہ ہے کہ اس میں کسی منضبط طرزِ فکر اور مربوط نظریۂ حیات کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس کے ظاہری اسباب خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ادب بالخصوص شاعری میں فکری عنصر کی بے حد کمی ہے۔ ہمارے شعری مواد کا بیشتر حصہ چند گنی چنی علامتوں ہزار ہا بار دہرائے ہوئے خیالات گھسی پٹی تشبیہات اور استعاروں تک محدود ہے۔ ولی اور سراج سے لے کر میر و غالب اور اقبال و جوش تک دیکھ ڈالیے، ایسے افراد شاید دو تین ہی نکلیں گے جنھوں نے انفرادی یا اجتماعی شعور و فکر کو آگے بڑھانے کی دشش کی ہے۔ غالب و اقبال کے بعد اس قبیل کے شاعروں میں صرف جوش اور فراق کے نام ہی لیے جا سکتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ابھرنے والے شعراء میں اس روایت کا علم بردار، ہمیں صرف ایک شخص نظر آتا ہے اور وہ ہے عبدالعزیز خالد جس کی شاعرانہ عظمت اور حیثیت ایک عرصے سے متنازعہ فیہ چلی آ رہی ہیں۔ پرانے جغادری قسم کے ادیب و شعراء اس کی عظمت کے منکر یوں ہیں کہ اس سے براہِ راست ان کی شاعرانہ حیثیت پر ضرب پڑتی ہے نئے طبقے کے لوگ اسے اس وجہ سے پسند نہیں کرتے کہ ان کا ہم عمر شاعر جس کی بقول شخصے لڑکیوں سے فلرٹ کرنے، رومانی نظمیں کہنے اور جذباتی شاعری کرنے کی عمر ہے، خواہ مخواہ بقراطیت چھانٹتا پھرتا ہے۔ اس کی فکر اپنے دیگر ہم عمر شعراء کے مقابلے میں کہیں زیادہ بالغ ہے جس کے آگے صرف ان کے ہی نہیں، ان کے بڑوں کی عظمت کے چراغ بھی گل ہو جائیں گے۔ ہمارے دور کی دوسری عام بدنصیبی یہ ہے ہم فن کار سے براہِ راست متعارف نہیں ہوتے۔ اس دور کا فن کار نقادوں کے دوش پر سوار ہو کر آتا ہے اور فتح و نصرت کے پرچم اڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جب سے تنقید کی باگ ڈور ہمارے پروفیسر قسم کے صاحبان نے سنبھال لی ہے تنقید کی مٹی بھی خوب پلید ہوئی ہے۔ اب تخلیق کی ادبی قیمت کا تعین اس کے خالق کی سماجی پوزیشن اور مرتبہ سے کیا جاتا ہے یا پھر اس کے ادبی رتھ میں جتے ہوئے نقاد گھوڑوں کی تعداد اور ان کے حسب و نسب سے اور اس میں بھی یہ التزام رکھا جاتا ہے کہ ان میں سے کون کس خطۂ زمین سے تعلق رکھتا ہے۔ اب "ادب" اور "سیاست" میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ دونوں چیزیں لازم و ملزوم بن کر رہ گئی ہیں لہٰذا اب نقدِ فن و ادب کے معیار بھی کچھ زیادہ ہی

جمہوری ہو گئے ہیں۔ اس جمہورت کی دہلیز پر ہر روز کتنے فن کار قربان کئے جاتے ہیں۔ اس کا شمار اس وقت ممکن نہیں۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ادبی جمہوروں نے کتنے فن کاروں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا اور کتنے ان کی دار و گیر سے بچ گئے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ جدید شعراء میں سب سے زیادہ باشعور اور بالغ فکر شاعر، عبدالعزیز خالد ہے۔ وہ اتنی تھوڑی سی عمر میں اردو ادب کو اتنا کچھ دے چکے ہیں جتنا بڑے بڑے انعام یافتہ اور جغادری قسم کے شعراء اور ادیبوں نے اپنی پوری زندگی میں بھی نہیں دیا ہوگا۔ خالد کے اب تک اٹھائیس مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان میں طبعزاد چیزیں بھی ہیں اور ترجمے بھی ہیں لیکن ہر جگہ شاعر کی انفرادیت ایک نئی آن اور شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ خالد کی شاعری کا خمیر عبرانی اور یونانی اساطیر اور مشہور عالم کلاسیکی قصہ کہانیوں سے اٹھا ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات کی فضا دیومالائی ہے۔ ہر چند، ان کے موضوعات پرانے ہیں لیکن انہیں پیش کرنے کا ڈھنگ بالکل اچھوتا اور نرالا ہے اور یہیں سے خالد تجرباتی حدود سے نکل کر تخلیقی شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ خالد کی یہ جسارت ہی کم اہم نہیں۔ کہ اس نے عہدِ عتیق کی کہانیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے چہ جائے کہ اس نے عہدِ قدیم کی پوری فضا کو من و عن برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ترجمہ بذاتِ خود مشکل کام ہے۔ بالخصوص کسی عظیم تصنیف کو اس کی تمام تر اسپرٹ فضا اور ماحول کی کامیاب عکاسی کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کسی کارنامے کی تخلیق سے بھی زیادہ مشکل امر ہے۔ خالد کا کمال صرف اس میں مضمر نہیں کہ اس نے ان کلاسکی شہ پاروں کو ان کی تمام تر فضا، اسپرٹ اور رعنائی کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے بلکہ اس ترجمے میں شعریت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ان کی پیشکش میں حد درجہ رنگارنگی تنوع اور جدت سے کام لے کر اردو شاعری کی مانوس فضا میں سمو دیا ہے۔ اس طرح یہ تخلیقات اردو دان طبقے کے لیے بھی اجنبی نہیں محسوس ہوتیں خالد کی مشکل پسند طبیعت اور حد درجہ دیدہ ریزی نے ان میں اپنا پن پیدا کر دیا ہے۔ جو لوگ ان تصنیفات کا براہ راست مطالعہ کرنے سے قاصر ہیں۔ انہیں خالد کے ترجموں میں اصل تصنیفات کے جملہ محاسن اور اوصاف مل جائیں گے۔ اکثر و بیشتر جگہوں پر خالد نے کہانی کے صرف مرکزی خیال کو اپنایا ہے۔ باقی گرد و پیش کی فضا، کردار نگاری، مکالمے وغیرہ سب خود اس کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں یہاں خالد کی تخلیقی صلاحیتیں معراجِ کمال پر نظر آتی ہیں۔ موقع و محل کے لحاظ سے کرداروں کا انتخاب، مکالموں کی برجستگی، مناسب اور برمحل تراکیب و تشبیہات کا استعمال مختلف کرداروں کے جذبات و احساسات کی کامیاب عکاسی یہ سب خالد کی خلاق طبیعت اور فطری حسن کاری کی رہینِ منت ہیں اور اس کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں خالد کی تمام تصانیف کا احاطہ اور اس کے جملہ کمالاتِ شعری کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک طویل عمل ہے جس کے لیے مناسب فرصت، وقت اور محنت کی ضرورت ہے لہٰذا میں صرف چیدہ چیدہ مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا جن کا انتخاب محض سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

دکانِ شیشہ گر کی پہلی تمثیل "حریرِ رگِ گل" کی اٹھان دیکھیے ؂

(ہیفاسٹس پینڈورا کے مجسمے کے سامنے) حُسنِ تخلیق کا اعجاز ہے یہ پیکرِ گل
میرے افکار کا آہو کہ تھا آوارہ خرام تہِ گرداب کہیں قلزمِ مینائی میں
کتنی مشکل سے ہوا دامِ نظارہ میں اسیر سالہا سال کی مہجوری و حزیں جاں کاہی
آج نیرنگیٔ قدرت سے مجسم ہو کر دل ربایانہ مرے سامنے استادہ ہے
طینِ لازب کا یہ رنتار و مکتا پیکر میری تصویر گری میری قلم کاری ہے!

ایک فن کار کو اپنی تخلیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے درد و کرب کے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کی تمام کیفیات اس مختصر سے بند میں سمو دی گئی ہیں۔

اس تمثیل کا مرکزی کردار بنی نوعِ انسان کا اولین معلم و محسن پرومیتھیس ہے جو زیوس کے قہر و جبر کا نشانہ محض اس لیے بنتا ہے کہ اس نے انسان کو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی سعادت سے روشناس کرایا۔ اس دنیا سے آب و گل کو دیوتاؤں کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی لیکن اپنے پائے استقامت میں لغزش نہیں آنے دی جس نے اسے مظلومیت، خلوص و ایثار اور ظلم کے خلاف سر فروشانہ نبرد آزمائی کا عظیم الشان سمبل بنا دیا۔ حریرِ رگِ گل میں پرومیتھیس کی زبان سے جو مکالمے ادا کرائے گئے ہیں وہ اس کے کردار کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ دیوتاؤں کے سفیر کو پرومیتھیس کا جواب دیکھیے ؂

دیوتاؤں سے مرا جب کوئی یارانہ نہیں کس تعلق سے قبول ان کے تحائف کر لوں
لاکھ الطافِ گرانمایہ ہوں دامن کشِ دل فقرِ خود دار نہیں خوگرِ تسلیم و رضا

دیوتاؤں کی عنایات سے مستغنی ہوں مجھے حاجت نہیں اس نکہت و ضوپاشی کی
دلِ پُرخوں نہیں پہلو میں جوالا مکھ ہے جس سے میں کسبِ ضیا کرتا ہوں
میرے خلاقِ تخیل کی فسوں کاری سے خود مرے ذہن کا کاشانہ پری خانہ ہے
میرے افکار، مرے عزم، مرے اندیشے ہیں مرے گوشۂ عزلت کے رفیق و دمساز

مختلف تمثیلوں کی فضا کے تانے بانے تیار کرنے میں شاعر کی خلاق طبیعت نے کیسے کیسے جوہر دکھائے ہیں ذرا اس کے بھی نمونے دیکھتے چلیے۔ حسنِ تشبیہ اور بیان کی نزاکتیں ملاحظہ ہوں ؂

غیرتِ ماہِ دو ہفتہ یہ عروسِ شنگول ہنس کی چال چلے مور کو شرمندہ کرے
نرگسی آنکھ ممولوں سے لڑے جس پہ پڑے سحر کرے دمِ گفتار و تبسم کھلیں رخسار پہ پھول

(حریرِ رگِ گل)

دمِ گفتار منہ سے پھول جھڑنا محاورہ ہے۔ لیکن دمِ گفتار و تبسم گلنار کے پھول کھلنے میں بڑی لطافت اور بلاغت ہے جس کا اصل لطف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے گلنار کی نرم و نازک ڈالیوں کو چٹکتے اور پھول بنتے ہوئے دیکھا ہے۔

ادھ کھلے ادھ مندے رس ریت بھرے نیندارے   آنگ میں آگ ہے یا میان سے باہر تلوار
بعضوی گات ستا برق، کچیں کا فوری   کس نے کنچن میں بھرا اینچ کے کٹ کا کینچن!
شاخِ زریں ہے ترا نام کہ انگور کی بیل   اے سکو چیلی لٹ مدبھری البیلی نار
تجھے ریحانہ پکاروں کہ کہوں مرجانہ   قدِ رعنا پہ ترے ذوقِ نظر ناز کرے
سرو و شمشاد دمن کو نظر انداز کرے   حیرت، و حسرت و امید کا در باز کرے

(حریرِ رگِ گل)

ماحول خوشگوار میں دانے پکیں رسیں   پھرتیلے چھورے چھیل چھبیلے کھلنڈرے
ہنس مکھ کنواریاں سمن اندام سانولی   چہرے پہ رس انار کا لالی گلاب کی
جیسے صراحیاں نہ چشیدہ شراب کی

(وفاداری بشرطِ استواری، دکانِ شیشہ گر)

تخیل کی گلکاریاں ملاحظہ ہوں ؎

میری نگاہِ شوق نے دیکھا ہے بارہا   گلزار و بوستاں چمک اُٹھتے ہیں جس طرح
جب آبشارِ نُور گراتا ہے ماہتاب   کرتے ہیں مشقِ ناز سرِ آسماں شہاب
اور اس سمے پہ خیمے ستاروں کی چھاؤں میں

(لا — دکانِ شیشہ گر)

وہ سنسناتی آنچ وہ موسم بہار کے   ہونٹوں پہ راگ رنگ نگاہوں میں پھلجھڑی
وہ لمحے نرم و نازک و شفاف و بے قیاس   جن کو بُنا ہماری مسرت کے واسطے
مشاطۂ ازل نے حریر و سمور سے

(وفاداری بشرطِ استواری۔ دکانِ شیشہ گر)

اُردو ادب میں ڈرامے کی روایت یوں بھی کچھ ایسی زیادہ جاندار و مستحکم نہیں ہے۔ جس کی بڑی وجہ غالباً اس برصغیر کی زندگی کی یکسانیت ہے۔ جو صدیوں سے بغیر کسی تغیر و تبدّل کے ایک ہی ڈگر پر چلی جا رہی ہے۔ ہر آن تبدیلی، ہر لحظہ انقلاب، ہر لمحہ تغیر، ڈرامے کی ہیئت و تشکیل اور ارتقاء کے بنیادی عناصر ہیں جن سے ڈرامے کی فضا تیار ہوتی ہے۔ کرداروں میں جان پڑتی ہے اور کہانی نقطۂ عروج تک پہنچتی ہے۔ ہمارے یہاں صدیوں سے زندگی ایک

لکیر کی مانند بے جان اور سپاٹ چلی آرہی ہے ایک ایسا خطِ مستقیم جس میں نہ کوئی موڑ ہے اور نہ کوئی نشیب و فراز جدّت و تنوع اور تغیر و تبدل کے فقدان نے ہمارے یہاں ڈرامے کو اچھی طرح پروان نہیں چڑھنے دیا۔ نثر میں تو ڈرامے کی بُری بھلی تھوڑی بہت روایت موجود ہے بھی لیکن جہاں تک منظوم ڈراموں اور "ایپک" کی طرز پر رزمیہ شاعری کا تعلق ہے تو اردو میں اس کی روایت بہت نئی ہے۔ اس نوع کی شاعری کو اردو دان طبقے سے صرف جدید نسل کے شعراء نے متعارف کرایا ہے۔ جن میں تصدق حسین خالد۔ رفیق خاور، جعفر طاہر اور عبدالعزیز خالد کا نام سرِفہرست ہے۔ اس قبیل کے شعراء میں عبدالعزیز خالد سب سے زیادہ بالغ نظر، بیدار مغز اور پُرگو ہے۔ خالد نہ صرف علوم جدیدہ سے بہرہ ور ہے بلکہ اس نے عربی، فارسی اور ہندی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے، تبحّرِ علمی اور وسعتِ مطالعہ کے لحاظ سے خالد نہ صرف ان شعراء میں بلکہ اس دور کے تمام شعراء میں ممتاز انفرادیت کا حامل ہے۔ خالد نے اپنے لیے جن موضوعات کو چنا ہے وہ مشکل بھی ہیں اور دوسروں سے منفرد بھی۔ وہ تصدق حسین خالد، رفیق خاور اور جعفر طاہر کا ہم سفر ہوتے ہوئے بھی ان سے بہت دور اور الگ ہے۔ خالد کی شاعری کا پس منظر عبرانی اور دیومالائی ہے۔ خالد نے اب تک جتنی تمثیلوں کو اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے اس میں اس نے اوریجنل ڈرامے کی اسپرٹ اور فضا کو پوری طرح بے قرار رکھا ہے ہر چند اس کے کردار عہدِ عتیق کی دیومالائی فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں لیکن ان کا ارضی مخلوق سے تعلق کبھی منقطع نہیں ہوتا تھا۔ یہ تمام کردار ہر دور کے کردار ہیں اور ان کی فکر ہر دور کے انسان کے فکر کی نمائندہ ہے۔ ان کرداروں کے خدوخال میں اس حد تک رنگ آمیزی کر دینا کہ وہ ہر دور کے انسان کی نفسیات کا سمبل بن سکیں خالد کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے صرف چند مثالیں ہی کافی ہوں گی — ایک خلّاق ذہن کا جذبۂ تعمیر دیکھیے۔

اپنے کاخوں کی سلگتی ہوئی خاکستر سے
آؤ مل جُل کے کریں تازہ نشیمن تعمیر
اور پیشانیٔ ایام پہ پھر ثبت کریں
سعیٔ پیہم کے نشاں عزمِ جواں کی تحریر
شوقِ تجدید سے صحرا کو گلستاں کر دیں
ذوقِ تخلیق سے کرلیں نئی دنیا تعمیر
جذبۂ عشق سے سرگرمیٔ بازارِ حیات
تیرے جلووں سے سلامت یہ جہانِ دلگیر
بزمِ کہنہ کہ خدا ساز تھی برباد ہوئی
محفلِ نو کو کریں خلدِ بریں کی تصویر

(حریرِ رگِ گل — دکانِ شیشہ گر)

کون جانے ابھی نادیدہ ہیں کتنے جلوے
کتنے نظارے تھرکتے ہیں ضمیرِ کُن میں
کیا دکھاتی ہے ابھی گردشِ دوراں دیکھیں
رقصِ نالندہ سنیں نغمۂ جولاں دیکھیں

(گو رقص کو سننا اور نغمہ کا دیکھنا محلِ نظر ہے)

فیض کا چشمہ کبھی ریت میں ہو سکتا ہے جذب
کیا خبر زمزمہ و رنگ کے سوتے پھوٹیں

شبِ تخلیق منوّر ہو چراغِ دل سے　　شمعِ الہام سے کاشانۂ دل روشن ہو

(آتشِ سوزاں ۔ دکانِ شیشہ گر)

انسان کی زندہ رہنے کی خواہش اور امنگ کا کتنا دلپذیر اظہار ہے ؎

جب کبھی موت نے آواز دی بولا ٹھہرو!
کیوں مروں، زندگی شیریں ہے جہاں رنگیں ہے
اور زیر و بم الحانِ حیات آگیں ہے

جنگ خواہ برائے امن ہی کیوں نہ ہو اس کا تصوّر ہی اذیّت ناک ہے۔ تصور کی اس اذیّت ناکی کا تعلّق کسی مخصوص دور یا عہد سے نہیں۔ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ جنگ کا تصور جنگ لڑنے والی قوم افراد کے جذبات اور احساسات کو کس حد تک متاثر کرتا ہے۔ نیز اس جنگ سے فریق اقوام کے افراد کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ ان تمام کیفیات کی عکاسی دیکھنے کے لیے تمثیل "لا" کی مثال ہی کافی ہو گی۔ اس ڈرامے کا پس منظر جنگ ٹرجن کا آخری زمانہ ہے۔ دس سالہ جنگ نے ہر دو فریقوں کو تباہی و بربادی کے کناروں پر لا کھڑا کیا ہے۔ جنگ لڑنے والے سپاہیوں کی اکثریت کو اس جنگ کا مقصد بھی معلوم نہیں وہ لڑنے پر اس لیے مجبور ہے کہ برسرِ اقتدار طبقے کا حکم ہے۔ حاکم طبقے کے عہد کی تکمیل کے لیے یہ قربانی کے بکرے کس انداز میں سوچتے ہیں اس کا بیان ملاحظہ ہو۔ یہ ردِ عمل خود جنگ شروع کرنے والی قوم کے سپاہیوں کا ہے ؎

اے بختِ نامراد یہ ہے فصل تیری　　ڈالے ہوئے پڑاؤ ہمیں اس اجاڑ میں
اس دشتِ بے گیاہ میں ہوتے ہوئے تباہ　　ایک ایسی واردات کا لیں تاکہ انتقام
بچپن میں جو ہمارے ہوئی رونما کبھی　　تھا باعثِ فساد وہ حسنِ فسوں نہاد
دیدار بھی نہ جس کا میسّر ہوا ہمیں　　پر کیا کریں نوشتۂ تقدیر ہے یہی
اس عرصۂ مصاف سے راہِ مفر نہیں　　یونانیوں کا عہد نہ پورا ہو جب تلک
درپیش ہے ہمیں یہی کاہش یہی کسک

قریباً اسی قسم کے تاثّرات کا اظہار ٹرجن سپاہیوں کی زبانی بھی کرایا گیا ہے۔ اس تمثیل میں ماضی کی حسین یادوں کی جھلک اور جذبۂ حبِ وطن کے ساتھ ساتھ حال سے بے اطمینانی اور سنہرے مستقبل کا خوش آئند تصوّر اور ان امیدوں کا ماتم بھی ملتا ہے جو فراوانیٔ حالات اور قدرت کی ستم ظریفی کی بنیاد پر مرجھا چکی ہیں۔ اس میں گرد و پیش کی فضا اور کرداروں کے جذبات و احساسات کی نہ صرف بڑی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے بلکہ اس میں انسان کی اعلیٰ سماجی اقدار سے وابستگی، ظلم و جنگ سے نفرت اور کسی ارفع و اعلیٰ نصب العین کے لیے

زندگی کو وقف کر دینے کا گہرا احساس بھی پا جاتا ہے۔ خیر و شر کا تضاد اس تمثیل کا بنیادی خیال ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ انسان کے ساتھ یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ آفاقی قدروں کا علمبردار اور حامل ہونے اور ہر چند نیک خواہش رکھنے کے باوجود بھی متحارب قوتوں کا آلہ کار بن کر جادۂ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اس تمثیل میں انسانی نفسیات کے ان ہی گوشوں کو شاعر نے اُجاگر کیا ہے۔

ہر دور کے انسان کی نفسیات کم و بیش اسی کشمکش اور تضاد سے دوچار رہی ہے اور اس دور میں بھی تمام اقوامِ عالم کے سامنے وہ گتھیاں عقدۂ لاینحل کی صورت میں موجود ہیں جو اب سے ہزارہا سال قبل ٹرائے کے میدان میں یونانی اور ٹروجن قوم کو درپیش تھیں۔ اس تمثیل میں جن نظریات کی تشہیر کی گئی ہے اس کا دائرہ صرف ٹروجن یونانیوں تک ہی نہیں پوری نسلِ انسانی تک پھیلا ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل بند کو دیکھیے۔ جمہوری طرزِ حکومت اور نقطۂ نظر کی افادیت اور ہمہ گیری کو کتنے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کیا ہمارے دور کے انسان کی فکر کی نہج اس سے مختلف ہے۔ اور کیا اس ترقی یافتہ دور میں بھی بنی نوع انسان کی اس ازلی خواہش میں کوئی نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ ؎

کل پُرزے ہوں مشینِ سیاست کے سب درست — جمہور ہوں نظامِ معیشت سے مطمئن
دولت فروغ و عزم و عمل کی ہوا تھی عام — ہر شخص اپنے خواب کی تعبیر آپ ہو
ہو اس کے ہاتھ اپنے مقدر کی باگ ڈور

کہیے، یہ خواب صرف پرومیتھیس کا ہے! یا ہر دور کی پوری انسانی برادری کا۔ اسی طرح کیپٹس کے جذبات اور خیالات ہیں جن کی جھلک عہدِ قدیم سے لے کر آج تک ہر دور کے باشعور افراد کے خیالات و جذبات میں ملتی ہے۔ شاعر نے ان خیالات کی تصویر کشی میں حد درجہ مہارت اور چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔

تطہیر و تزکیہ تو ہے اک مقصدِ عظیم — ہو مادرِ وطن کے حقیقت میں تم سپوت
موقع ہو تو دلاؤ جفاکش عوام کو — جابر کے پنجہ ہائے زبردست سے نجات
توفیقِ کار کاش میسّر ہو دونوں کو — ہو جاؤ تم تدبّر و تدبیر میں مگن
میں منہمک تصوّر و تصویرِ حسن میں

برف گرے جب موسمِ گل میں — آپس میں مل جاتے ہیں
ایک ہیں سب یونانی ٹروجن — فرق نہیں کوئی ان دنوں میں
ایک ہی پھلواڑی میں جیسے — رنگ برنگے پھول کھلے ہوں
ایک ہی ایوانِ عشرت میں — فانوسِ صد پہلو روشن

غنچہ کھلے گا تو بکسے گا ہم سے تو لیکن غنچہ اچھا
موت شباب کی پرچھائیں ہے وقت رواں کے آئینے میں
موت کے باعث نغمہ لبوں پر آہ ادھورا رہ جاتا ہے
وقت کا دریا بہہ جاتا ہے ہلتا ہے اک ہاتھ ہمیشہ
ساتھ ہمارے پرپوشیدہ ہاتھ یہ مرگِ مبرم کا ہے
جس کا کٹیلا وار ہے کاری آج مری کل تیری باری
کام کسی کی آئے نہ یاری
بے صرفہ ہے آہ و زاری

(لا ۔ دکانِ شیشہ گر)

ہر آن انقلابات اور حادثات سے دوچار ہوتی ہوئی زندگی کی تصویریں سلونیس کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں ؎

تحسین و مرحبا کے تلاطم کے باوجود رہتا ہے یہ خیال حریم دماغ میں
یہ چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہر جلوہ کائنات کا ناپائیدار ہے
فانی شباب و حسن گریزاں بہار عمر

یا پھر ؎

اس عرصۂ جہاں میں ہر اک شے ہے بے ثبات ہر لمحہ زندگی کا ہے مرہونِ حادثات
تقدیر سے کر آشتی نفرت کو بھول جا ممکن ہے کس طرح بھلا مُردوں سے دشمنی!
تلوار اپنے سر پہ لٹکتی ہے موت کی آجائے گا اجل کا بلاوا ہر ایک کو
دشمن ہو یا کہ دوست پرو نیکس تم کہ ہیں سب چلتے پھرتے لاشے ہیں زندہ نہ جانیو

الغرض تمثیل کے تمام کردار بلا تخصیص رنگ و نسل، مذہب و ملت پوری نسلِ انسانی کے نمائندہ ہیں اور ان کے اصلی رنگ و روپ اور خدوخال کو اجاگر کر کے انھیں جملہ اقوام عالم کے تمام افراد کو سمبل بنا دینے کا سہرا عبدالعزیز خالد کے سر ہے جس کی جوان فکری اور شادابی نظر نے ان کرداروں میں جان ڈال دی ہے۔ کوئی موقع ہو، کیسا ہی محل ہو شاعر کا تخلیقی شعور ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ خالد کا خود کو بازیافت کا شاعر کہنا دراصل محض خاکساری ہے ورنہ درحقیقت وہ عظیم فن کار اور بے حد تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے جس کے ثبوت میں اس کے

محض چند ڈرامے ہی پیش کر دینا کافی ہے۔ مختلف مواقع پر خالد نے اپنے کرداروں سے جو مکالمات ادا کرائے ہیں ان کی ادائیگی میں خالد نے بڑے سلیقہ کا مظاہرہ کیا ہے۔

جن پیغامات اور نظریات کو کرداروں کے ذریعے ادا کرایا گیا ہے۔ وہ آفاقی قدروں کے حامل ہیں۔ حرمت فن اور سماج میں فنکار کے مقام کا تصور بزبان ایلوس ویلری اور موزرٹ ملاحظہ ہو ۔

ایلوس: نقاش منتظر ہیں یدِ حسنِ کار کے
اصنام آرزو و بتانِ خیال کو
اہل جہاں کے عیش و مسرت کے واسطے
آباد و منتقل کرو اجسامِ سنگ میں
حسنِ نظر ہو پیکرِ محسوس میں اسیر
فن کار کی تو سعیٔ مسلسل میں ہے نجات
ہے روزگار اس کا عبارت ریاض سے
اظہار کے وسیلے ہیں سرچشمۂ حیات
ان کے بغیر اس کو کہاں لطفِ زندگی

(لا۔ دکانِ شیشہ گر)

سیکوی میرے نغمے، مرے افکار میرے نقش و نگار
جو پلے ناز سے گہوارۂ چشمِ تر میں
راکھ کا ڈھیر بنے کو بکو آوارہ ہوئے
جنھیں سیراب کیا خونِ تمنا سے وہ پھول
کھلے کم کم پہ شگفتہ نہ ہوئے خاطر خواہ
موتی مٹی میں ملے دل میں رہی دل کی چاہ
کوئی فن کار کی خلوت کا سماں تو دیکھے
پے بہ پے سوزِ دروں، دم بدم احساسِ زیاں
مستزاد اس پہ ملامت گریٔ اہلِ زباں۔
زندگی نام ہے شاید اسی مجبوری کا!

(آتشِ سوزاں)

موزرٹ: ہم کہ ہیں منتخب عصرِ حیدرانِ زماں
شادو آوارہ شہیدانِ خیالات و زباں
دامن آلودہ نہیں رکھتے افادیّت سے
ہم کہ ہیں میکدۂ حسن کے پیرانِ مغاں
غم نہیں ہم پہ اگر ہنستے ہیں اربابِ جہاں
ہم سے پائندہ ہیں تہذیب و تمدّن کے نشاں
ہم ہیں گلبانگِ درا، قافلہ سالارِ خیال
پاسبانِ حرمِ عاشقی و دیرِ جمال
نہیں اس دولتِ فن کو کبھی نقصان و زوال
یعنی رہتے ہیں سدا روبہ فروغ اہلِ کمال
ہیں ہمیں اہلِ نوا خاصۂ خاصانِ خدا

(آتشِ سوزاں - دکان شیشہ گر)

کم وبیش اس قسم کے خیالات کا اظہار خالد کی دوسری تخلیقات میں بھی ملتا ہے، کہیں کہیں یہ اظہار طنز و مزاح کے پردوں میں چھپا ہوا ہے اور کہیں کہیں شاعر براہِ راست فنکاروں سے مخاطب ہے ؎

منزلِ فن دور ہے، عظمتِ فن دور تر — آہوئے وحشتِ سخن ہوتا ہے مشکل سے رام
مسندِ عظمت پہ ہیں خونِ جگر کے نشان — شہرتِ جاوید ہے ثمرۂ سوزِ دوام

(زنجیرِ رمِ آہو)

آساں نہیں کچھ ایسا شیوہ نواگری کا — آشوبِ چشم و دل ہے افسونِ شعر و حکمت
پیغمبری سے پہلے لازم ہے خود گدازی — غاروں سے پھوٹتا ہے سرچشمۂ ہدایت
توفیقِ فکر کو ہم اعجاز جانتے ہیں — غافل یہ داغِ دل ہے گنجینۂ سعادت

(غبارِ خاطر - زنجیرِ رمِ آہو)

مقصدیت بغیر مقصد کے ــ!
فن کے پردے میں ایک عالم ہے

(کلکِ موج)

خالد کی جدّت پسند طبیعت، زبان و بیان پر بے پناہ قدرت اور معجز کلامی کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو "سرودِ رفتہ

پڑھیئے۔ گو یہ مجموعہ یونان کی مشہور شاعرہ سیفو کے کلام کا ترجمہ ہے لیکن یہاں بھی خالد کی تخلیقی صلاحیتوں نے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ الفاظ و بحور کا انتخاب حسبِ ضرورت ردیف و قوافی کا اہتمام تصنیف کی اوریجنل سپرٹ اور معنوی ہئیت برقرار رکھنے میں خالد کے ذہن رسا نے بڑی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ خالد نے بجمال خوش اسلوبی زبان و بیان کی لطافت اور نزاکتوں کے ساتھ ساتھ حتی الامکان شعریت اور تاثر کو بھی برقرار رکھا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔ اس پہ ترجمے کی بجائے تخلیق کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ذرا چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

الہام حقیقی نے کیا ہے جنھیں تخلیق
کرتی ہوں ان الفاظ سے تحریر کا آغاز
ہو تاکہ مرا شعر طرب خیز و فسوں ساز

؎ کوئی اترے تو دل دریا سمندر سے بھی گہرا ہے — صدف ہے سینۂ صافی، فغانِ آرزو گوہر

؎ وہ بیتے زمانے وہ موسم سہانے — تری دل فشانی، تری نغمہ خوانی
دلوں میں جگائی تھی جب سوئے جادو — سناتی ہے وہ ان سموں کی کہانی

ذرا لطفِ زبان دیکھیئے ؎

لہجے کی مرکیوں میں گھلاوٹ وہ شہد کی
آنکھوں میں ناچتی ہے ہنسی جو دبی دبی
اس نامراد دل میں لگاتی ہے آگ سی

؎ بجھا کر ستاروں کی کم تاب شمعیں — بچھاتی ہے قلزم پہ کرنوں کی چادر
گماں پگھلی چاندی کا پگڈنڈیوں پہ — مہکتی ہیں پھلواریاں اوس کھا کر

؎ چاند کا زرد مرمریں چہرہ — قلزمِ نیلگوں میں ڈوب گیا
شعلہ پروین کا بجھ کے راکھ ہوا — رات بھیگی گریز پا لمحے
منزلِ نور کو روانہ ہوئے — سیج سونی ہے خوابگہ تنہا
اے شبِ تار، اے دلِ رسوا!

تشبیہ اور استعارے کی طرح تلمیح بھی اردو شاعری کا جزوِ لاینفک رہی ہے۔ شاعر کی عظمت کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اس نے تلمیحات کا استعمال کس خوبصورتی سے کیا ہے۔ محض ایک لفظ کے استعمال سے قاری کی توجہ کو کسی مخصوص واقعہ کی طرف اس طرح منعطف کرا دینا کہ اس کی نگاہوں میں اس واقعہ کا پورا پس منظر اور تفصیل پھر جائے یقیناً معجزہ سے کم نہیں۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ جب شاعر خود بھی اس واقعہ کی نوعیت، مکمل پس منظر،

اس سے وابستہ کرداروں کے عمل اور رواداری کی جملہ تفاصیل سے باخبر ہو، خالد نے اس سلسلے میں بڑی مہارت اور ہنرمندی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے کلام میں انھوں نے جتنی تلمیحات استعمال کی ہیں اُردو اَدب کے کسی شاعر (ماسوا اقبال کے اور عین ممکن ہے کہ خالد ان سے بھی آگے ہو) نے استعمال نہیں کی ہوں گی۔ اس لحاظ سے اگر انہیں تلمیحات کا بادشاہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ خالد کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی ادب پر بھی ان کی نگاہ بہت گہری ہے لہٰذا لازمی بات ہے کہ ان پاس تلمیحات کا خزانہ دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوگا۔ اس ضمن میں "کلکِ موج" کے صرف چند اقتباسات کا حوالہ ہی کافی ہوگا۔ یوں تو اس کی اسی کتاب میں اتنی تلمیحات مل جائیں گی جتنی دورِ حاضر کے تمام اردو شعراء کے مجموعی کلام میں بھی نہیں ہوں گی لیکن میں اس کی صرف ایک ہی غزل کے حوالے پر اکتفا کر رہا ہوں ؎

جسم ہے پیمانۂ صہبا کہ تاکستان کی بیل ۔۔۔ جادوئے بابل ہے آنکھوں میں کہ سحرِ سامری
آزر و مانی کے بُت خانے پری زادوں کے غول ۔۔۔ سانس لے زرتشت کے آتش کدوں کی روشنی
جیسے پرناسس پہ جھمکے ہوں بناتُ النعش کے ۔۔۔ سرو و ساج و ارغواں کرتے ہیں یوں سیرِ مری

خالد صرف وسیع تناظرِ علمی، گہرے تفکر اور فلسفے کا ہی شاعر نہیں زندگی کی رومانی اور جمالیاتی قدروں کا بھی شاعر ہے۔ اس کے کلام میں جہاں فکر و فلسفے کی رفعت اور گہرائیاں نظر آتی ہیں وہاں جذبات و احساسات کی رنگارنگی اور بوقلمونی بھی ملتی ہے جس نے اس کی شاعری کو آئینۂ صد رنگ بنا دیا ہے۔

خالد کا ذوقِ جمال بہت ستھرا اور بلند ہے۔ جہاں اس کی بصیرت قطرہ میں دجلہ دیکھ لینے اور پھر اسے دوسروں کو دکھلانے کی قوّت اور صلاحیت رکھتی ہے۔ وہاں اس کی بصارت گردوپیش بکھرے ہوئے جملہ مظاہرِ حسن و جمال کا احاطہ کر لینے پر بھی قادر ہے۔ قدرتِ کاملہ نے اسے دروں بینی اور ژرف نگاہی کے ساتھ ساتھ حسن کاری اور شدید جمالیاتی احساس بھی ودیعت کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے یہاں جذبۂ تخیّل کی گرفت میں آتے ہی رنگین تجسیم اختیار کر لیتا ہے جو ذہن کے نگارخانے نکلتے ہی قوسِ قزح کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس قوسِ قزح کے کچھ رنگ آپ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کچھ یہاں اور دیکھ لیجیے ؎

شام و سحر کا پگھلتا سونا
میٹھا گرم گھنیرا جادو
عشق انگیز تُلنگِ آہو
جوت جگاتی چشمِ پُرفن
یہ جانی پہچانی خوشبو

کھیت گنوارے فصل سہاگن
یہ رمنے کہساروں کے یہ
جیسی بنجارے اپنے ہیں
رنجِ نفس سے جن کے چراغاں
نقشِ قدم سے جن کے بہاراں
عرش سے بھاری بھول سے ہلکے
خاک پہ چلتے پھرتے انساں
یہ سب نظارے اپنے ہیں
سینۂ کوہ سے پھوٹتے جھرنے
عشرت خیز رسیلے نغمے
چہلیں کرتے پنکھ پکھیرو
مدھ متوالی مست اڑانیں
چرواہوں کی رسیلی تانیں
ہاتھ میں پکڑے تیر کمانیں
اپنے مسکن ہیں یہ چٹانیں
بھیگی بھیگی گھاس بچھونا
رنگ افق سے عکس شفق سے
پگھلی چاندی بہتا سونا

ابر ابر نکھرے نکھرے — رین نظارے بکھرے بکھرے
روپ بدل کر بنتِ عنب کا — بن کے نشہ صہبائے طرب کا
نجم سحر کا کوکب شب کا — انجمنِ احساس پہ چھا جا
پہلو میں دل بن کے سما جا — اے پروردہ دامنِ صحرا

(طیور آوارہ - زنجیر رمِ آہو)

۵ کھلتے ہیں سمندر پہ طلسمی غرفے!
ہیں رنگ محل لالہ رخوں کے مسکن

ے آہوے وحشی نے شاید تم سے سیکھی یہ ادا چوکڑی بھرنا، پلٹ آنا، ٹھہرنا، دیکھنا

ے آئیں جائیں طرح طرح کے خیال تیرے گیسو ہوا میں لہرائیں

ے پردے میکدے کے ہیں یا پلک کی جھالریں
دستِ گل فردش میں گلستاں کھلا ہوا

(کلکِ موج)

اس نوع کی تصویریں اردو شاعری میں کمیاب ہیں۔ موجودہ دور کے شعراء میں غالباً صرف فیض کے یہاں یہ رنگ ملتا ہے۔ مثلاً ے

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے آؤ ایک دن دلِ پرخوں کا ہنر تو دیکھو

غالب کا ایک مشہور شعر ہے ے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اسی سے ذرا ملتی جلتی خالد کی تصویر کا رنگ و روپ ملاحظہ ہو ے

کتنے چہرے درو دیوار کے آئینے سے غم گسارانہ مجھے تکتے ہیں!

خالد کے غنائی احساس اور تخیل کی گل کاریاں صرف منظر کشی یا "حسیاتی تصویروں" تک ہی محدود نہیں۔ اس کی "صوتی" تصویریں بھی دیکھیے ے

سیب کے بغیچوں کی مست آب ریزوں میں
ہر طرف چھنا کے ہیں جلترنگ بجتے ہیں
سرسراتے پتوں سے نیند کی مدھر لہریں
دھیرے دھیرے چھن چھن کر گر رہی ہیں پلکوں پر
معصفر پیرہن پہنے حسینوں کے پرے نکلے
مٹکتی چال مدھ ماتی چلیں بچھووں کو چھنکاتی

ع مجیرے جھنجھناتے رس بھرے گھنگرو چھنکتے تھے

ع چھلکتے میکدوں میں جام و مینا جھنجھناتے تھے

(سرودِ رفتہ)

ع بجتی ہوں پائلیں کسی مہ وش کے پاؤں میں

(حریرِ رگ گل)

چاند جیسے ہار مرجھایا ہوا تارے جیسے دانہ دانہ آبلے
چال میں اسلوب بادِ مہرگاں گفتگو جیسے کہ شہنائی بجے

(کلکِ موج)

احساس و تخیل کی نغمگی کے ساتھ ساتھ رنگوں کی تمیز اور ان کو استعمال کرنے کے سلیقے میں موجودہ دور کے شاعروں میں باستثنائے فیضؔ، خالدؔ کا کوئی ہمسر نہیں۔ ہر دور کے کلام میں رنگ و بو کا طوفان امنڈتا ہے لیکن دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ فیضؔ کا گلستانِ تخیل فکر کی گراں باری کا متحمل نہ ہونے کی بنا پر نکہت و خوشبو اور بو باس سے تہی ہے۔ برخلاف اس کے خالدؔ کا احساس اور تخیل فکر کی بھٹی میں تپ کر نکلتا ہے جس کی بنا پر اس کے رنگ کچھ اور بھی گہرے اور پائیدار ہوتے ہیں۔ شعور و فکر کی بالیدگی اور توانائی کے باعث اس میں خود بخود مہک اور خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یہاں خدانہ خواستہ فیضؔ کی کوئی تنقیص مقصود نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے جس کا ان لوگوں کو بخوبی اندازہ ہوگا۔ جنھوں نے فیضؔ اور خالدؔ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ ہر دو کے یہاں جذبے کی شدت، احساس کی لطافت اور تخیل کی بے پناہ رنگینی ہے لیکن خالدؔ کی فکری سطح فیضؔ کے مقابلے میں بلند ہے جس کی بنا پر اس کے کلام میں نسبتاً زیادہ رفعت توانائی، گیرائی اور گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ دوئم فیضؔ کے جذبہ کی رنگینی اس وقت سے متصف نہیں جیسی کہ خالدؔ کے یہاں ہیں۔ یہ فرق غالباً ہر دو شخصیتوں کے تفاوت کی بنا پر ہے۔ فیضؔ نرم و گداز طبیعت کے مالک ہیں لہٰذا ان کی شخصیت میں فعالی عنصر کی کمی اور اس قوت کا فقدان ہے جو سنگلاخ دیواروں اور پہاڑوں کو چیر کر اپنا راستہ پیدا کرتی ہے اس کے برعکس خالدؔ بڑی قوی اور فعال شخصیت کا مالک ہے جسے راہ کی ہمواری اور پُرخاری کا چنداں احساس نہیں ہوتا۔ ہر دو کا کلام ان کی شخصیتوں کا آئینہ دار ہے۔ فیضؔ کی شاعری صرف باعثِ شادابیٔ قلب و نظر ہے روح کی سرگشتگی اور ذہن کی بالیدگی سے اسے کچھ سروکار نہیں جبکہ خالدؔ کی فردوسِ تخیل میں رعنائی بہار کے ساتھ ساتھ طلسمِ فکر و معانی کے تہہ در تہہ متعدد جہاں آباد ہیں۔ قاری کے قلب و ذہن کو قدم قدم پر اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

گو خالدؔ بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے لیکن غزل کے معاملے میں بھی اس نے ہم کو مایوس نہیں کیا۔ اس کی بیشتر غزلیں بہت سے اچھا کہنے والوں سے بہت اچھی ہیں۔ ان غزلوں میں رفعتِ فکر، شوکتِ تخیل، لطافتِ احساس، حسنِ زبان و بیان شگفتگی، شعریت، تاثر اور تغزل سب کچھ ہی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تنگنائے غزل میں خالدؔ کی جولانیٔ طبع نے کیسے جوہر آبدار دکھائے ہیں اس کے لیے "زنجیرِ رم آہو" یا "کلکِ موج" میں سے کسی ایک کا ہی مطالعہ کافی ہے۔ خالدؔ کی غزل تفصیلی مطالعہ کی محتاج ہے۔ آپ صرف چند مثالیں دیکھیے ورنہ خالدؔ کے یہاں ایسے سینکڑوں جواہر ریزے ہیں جن کی جوت نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

بے دلی موت ہے اندیشہ و پامردی کی
بے دلی ہمت و ناموس کی رسوائی ہے

کبھی رکتے نہیں رہوارِ تمنا کے سوار
تم ہو، جولانگہِ آفاق کی پہنائی ہے

ہمارے جیب و گریباں ہیں چاک چاک سہی
ہم اپنے جیب و گریباں کے چاک سی لیں گے

چراغِ راہ گذر بجھ چکا ہے بجھنے دو
دل و نظر کے چراغوں سے روشنی لیں گے

جل اُٹھتے ہیں حسین دیے آرزوؤں کے
ایوانِ غم میں آج بھی تیرے خیال سے

کون ہے محرم یہاں رسم و رہِ شوق کا
زندگی محرومیاں عاشقی رسوائیاں
(زنجیرِ رمِ آہو)

شعر و سرود ہے یا جادو کا کارخانہ
بادل سے آگ برسے پتھر سے پانی نکلے

اے موج موجِ دریا، اے سیلِ سیلِ باراں
دل بوند ہے لہو کی پر محشرِ معانی

رم جھم برس رہی ہے گھٹا جی نڈھال ہے
اے یارِ دل نواز، شبِ برشگال ہے

قربتِ حسن میں کم حوصلہ اربابِ ہوس
اپنے ہی سانس کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں

جھڑتے ہیں پتہ پتہ اوراقِ نخلِ ہستی
کچھ جل کے کوئلہ کچھ زیرِ زمیں نہاں ہیں

گرتی ہے قطرہ قطرہ مے جامِ زندگی سے
تلچھٹ کو پھینکنا مت، یہ بوندیاں گراں ہیں

لبِ میگوں دلیلِ عذرِ مستی
رخِ روشن جوازِ بت پرستی

سدا آباد بھی برباد بھی ہے
یہ دل خانہ بدوشوں کی ہے بستی

قیامت ہے کہ بازارِ جہاں میں
ہوس مہنگی، متاعِ دردِ سستی

سکوں ہے قرۃ العین تلاطم گہر کی پرورش کرتا ہے دریا

اس زیارت گاہ کی مانند ہوں اٹھ چکی ہو جس کی حرمت ہائے رے

ہوتا ہے سمندر میں ہر انداز کا موتی تقدیر ہے غوّاص کی ہاتھ آئے نہ آئے

(کلکِ موج)

خالد کا کلام معائب سے خالی نہیں ہے متعدد زبانوں پہ کامل دسترس رکھتے ہوئے اور لامحدود ذخیرۂ الفاظ کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس کے یہاں زبان کی ایسی کافی غلطیاں موجود ہیں جو ایک عام قاری کو بھی کھٹکتی ہیں مثال کے طور پر چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

ع خیالوں کی تری آنکھوں میں چل پھر

(چلت پھرت کو چل پھر کہنا اور بولنا غلط ہے)

ع رقص نالندہ سنیں، نغمۂ جولاں دیکھیں

(رقص کا سننا اور نغمہ کا دیکھنا اپنی سمجھ میں نہیں آتا)

ع جسم نرگس ہے، سانس خوشبو ہے

اب تک تمام ادیب و شعراء محض آنکھ کو نرگس سے تشبیہہ دیتے رہے ہیں جسم کو نرگس کہنا شاعرانہ اجتہاد ہے)

کسی خیال و مضمون کو اپنانے کا لطف محض اس وقت آتا ہے۔ جب شاعر اسے اپنے پیشروؤں سے بہتر انداز میں پیش کرے بصورتِ دیگر یہ شاعر کی ناکامی کی دلیل ہے خالد بھی اس قسم کی ناکامیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔

؎ غیروں کے چاک جیب و گریباں سئے، مگر دامن کو اپنے کر نہیں سکتی رفو

(اوروں کے سئے پیرہن و چاک گریباں۔ ممنون تبا صورتِ سوزن نہ ہوئے ہم۔ کے مقابلے میں پست ہے)

؎ باعثِ تعمیر و طرح نو ہے خرابی

زہر میں تریاق ہے فنا میں بقا ہے

(یہ شعر غالب کے اس شعر کے آگے لطف نہیں دیتا

؎ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

---

٥ چشم (اصل)

ے پیلا چہرا بھی ہے مصیبت
خواہاں ہر شخص آبرو کا
(اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

کے سامنے پست معلوم ہوتا ہے)

ے چُراتے ہوں نگاہیں کس لیے شب بھر کہاں تھے
خمار آلودہ نظروں میں بھری ہے نیند اب تک

(خالد کا اندازِ بیان اس شعر کے مقابلے میں کس قدر کمزور ہے ے
یہ اُڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ)

اس کے برعکس خالد کے دو شعر دیکھیے کس قدر خوبصورت اندازِ بیان ہے۔

ے مخمل و بانات کے پامال پھول جی اُٹھیں گویا خرام ناز سے

(معنی و مفہوم اور اندازِ بیان کے اعتبار سے غالب کے اس شعر کی ہمسری کا دعویدار ہے ے
دیکھو تو کوئی شوخیٔ اندازِ نقشِ پا موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ے چلا جاتا ہوں تنہا پا پیادہ
نہیں کوئی میری منزل کا راہی

(تقریباً یکساں مضمون کے شعر ے
چلا جاتا ہوں میں وحشت کے بل پر خدا جانے مری منزل کہاں ہے

کے مقابلے میں کہیں بہتر اور پُر معنی ہے)

خالد کے لب و لہجہ میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے۔ سنجیدگی اور عالمانہ وقار ہے۔ بالعموم وہ کبھی عمومی سطح پر آکر گفتگو نہیں کرتا لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس کا رہوارِ تخیل ریختی کے میدان میں بھی خوب سرپٹ دوڑتا ہے۔ کبھی کبھی جمالِ فطرت کا یہ پرستار تلاشِ حسن میں پیکرِ آب و گل کے رنگین محرابوں، خمدار قوسوں اور دلدار گولائیوں سے پھسل کر طلسمی غرفوں اور منقش جھالروں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ فکر و نظر کا یہ ابتذال خالد جیسے ثقہ اور سنجیدہ شاعر کو کہاں تک زیب دیتا ہے اس کا فیصلہ خالد پر ہی چھوڑا جاتا ہے۔

× نئے ایڈیشن میں یہ شعر نہیں۔

خالدؔ کے کلام میں اعلیٰ شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں وہ عوام کا نہیں خواص کا شاعر ہے۔ یوں بھی صرف اعلیٰ شاعری کیا فنونِ لطیفہ کی کسی بھی صنف کا براہِ راست عوام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بالعموم اس کا تخاطب ملک و قوم کے باشعور افراد اور ذہین طبقے سے ہوتا ہے، چنانچہ خالدؔ بھی اسی طبقہ سے مخاطب ہے۔ لہٰذا اس کی ذات سے عوامی سطح تک اُتر آنے کا مطالبہ بھی درست نہیں فن کارانہ عظمت اور شہری محاسن سے قطع نظر خالدؔ کی شخصیت یوں بھی وقیع اور قابلِ تعظیم ہے کہ اس نے اُردو زبان کو نیا اسلوب اور نیا آہنگ دیا ہے۔ نئی فرہنگ بخشی اور اس کا دامن تا حدِ نظر وسیع کر دیا ہے۔ خالدؔ کا کمال صرف یہی نہیں کہ اس نے ہمیں عظیم اور اعلیٰ شاعری سے روشناس کرایا بلکہ اصل کمال یہ ہے کہ اس نے سب کچھ اردو زبان میں کیا ہے۔ وہ ہم سے ادق الفاظ اور مغلق زبان میں بات ضرور کرتا ہے اور کہیں کہیں اس کے یہاں ماحول کی اجنبیت اور لب و لہجہ کی غیر مانوسیت کا بھی احساس ہوتا ہے لیکن پچھلے کچھ دنوں سے خالدؔ کے اس رجحان میں نمایاں تبدیلی ہوتی جا رہی ہے۔ زبان عربی و فارسی کے اثر سے نکل کر آسان اور سلیس ہوتی جا رہی ہے۔ اور خیالات بھی علمیت کے بوجھ سے قدرے آزاد ہوتے جا رہے ہیں۔ خالدؔ کے یہاں یہ خوشگوار تبدیلی اچھی علامت ہے۔ جس کا تمام طبقوں میں یقیناً خاطر خواہ خیر مقدم کیا جائے گا۔

کلیم اختر

عبدالعزیز خالد

انسانِ کامل کی تلاش میں

عبدالعزیز خالد کا شمار بجا طور پر اُردو زبان کے ان عظیم شاعروں میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کو نئے معانی دیئے۔ اسے ایک انوکھے اسلوبِ بیان سے بہرہ مند کیا۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں نہ صرف دنیا کی مشہور زبانوں کی نادر تعبیرات اور کلمات کو سمویا بلکہ ان کے لازوال گنج ہائے معانی کو بھی منتقل کر دیا۔

عبدالعزیز خالد کا ہر نیا مجموعۂ کلام اُردو پڑھنے والوں کے سامنے فکر و فن اور حروف و معانی کا ایک نیا جہان وا کرتا ہے۔ اس کی نظر لا انتہا وسیع بھی ہے اور بے حد عمیق بھی۔ وہ دنیا کے سب ادبی و فکری شہ پاروں پر عبور رکھتا ہے۔ ان سے انمول موتی چنتا اور انہیں بڑے سلیقے سے سجا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ پورے عالمی ادب کے سمندر کا شناور ہے اور اس کے مطالعہ کی کوئی حدود نہیں اس کو مشرق اور مغرب کے ادب پارے ازبر ہیں اور جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اس کے فکرِ خلاق کے روبرو حاضر ہیں۔ چنانچہ خالد کی شاعری کا مزاج اور لہجہ خالصتاً انسانی اور روحانی ہے اور اس کی اساس ان آفاقی صحیفوں اور عظیم دانشوروں کے افکار پر قائم ہے جو قرنہا قرن سے فکرِ انسانی کو متاثر کرتے چلے آرہے ہیں۔ بالفاظ دیگر خالد کا طائرِ تخیل ان فضاؤں میں محوِ پرواز ہے جہاں صرف محدود سے چند انسانوں ہی کی رسائی ممکن ہے، فلسفہ و حکمت، تاریخ و تہذیب اور علم و فن کے نشیب و فراز کے واضح اشارے ہی نہیں ملتے بلکہ جہاں گزران کی شاخ در شاخ پھیلی ہوئی داستان بھی ملتی ہے القصہ تاریخ و تہذیب کی اس گم شدہ میراث اور انسانِ کامل کی جستجو میں وہ ہر اس مقامِ فکر و دانش سے گزرے ہیں جہاں تک ان کی ذہنی رسائی اور قلبی واردات انہیں لے جاتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ خالد کی زندگی علامہ اقبال کی مانند کبھی سوز و سازِ رومی" اور کبھی "پیچ و تابِ رازی" کی کشمکش سے نہ گزری ہو۔ مگر میں یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ بحیثیت مجموعی ان کے کلام پر علامہ اقبال کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ　　میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

خالد کی شاعری اُردو شاعری کے کسی روایتی ادبی دبستان کی پابند نہیں۔ اس نے ایک اندازِ نگارش کی بنیاد رکھی ہے جس نے اُردو زبان کے دامن کو ان زبانوں جو کلاسیکی ادب کی حامل ہیں کے اسلوب سے ہم کنار کر دیا ہے۔ شاعری کے باب میں خالد کی اس کاوشِ فکر اور طرزِ سخن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو بحیثیت ایک زندہ زبان کے بلاشبہ عربی، فارسی، انگریزی سنسکرت اور ہندی کے ہمسر اور ہم پلّہ ہی نہیں بلکہ اپنے اندر دیگر زبانوں کے الفاظ کو سمونے کی کشش بھی رکھتی ہے اور کشادگی بھی۔ اور اب یہ کام قلمکاروں کا ہے کہ وہ اس اندازِ بیان کو کس قدر مقبول بناتے ہیں۔

خالد اپنی شاعری کا ناطہ اس قدیم شاعرہ سے جوڑتے ہیں جسے سقراط نے "حسین سیفو" کے نام سے پکارا تھا اور ٹولیس لارئیس نے یہ کہہ کر زندہ جاوید بنا دیا کہ "مٹی لین کی مغنیہ کو مردہ نہ کہو ایسا کوئی دن طلوع نہ ہوگا جس میں نغمہ سنج سیفو کا نام روشن نہ ہو۔"

عظیم سیفو کے بارے میں اس حوالہ سے خالد یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کائنات میں وہ عظیم ترین ہستی کون ہے جس کی آمد سے دنیا کی تاریکی چھٹی اور ہر سو روشنی پھیل گئی۔ خالد اس عظیم المرتبت شخصیت کی تلاش میں نکلتا ہے جو جمیل و جلیل بھی ہے اور حلیم و بشیر بھی اور جس کی پاکیزگی کی قسم خود خالقِ کائنات نے کھائی ہے۔ اس محترم و مقدّس وجود کی تلاش میں خالد آسمانی صحیفوں کی ورق گردانی کرتا ہے جو انبیاء کرام کی وساطت سے نسلِ انسانی کو پہنچے۔ وہ یونانی حکماء اور فلاسفہ کے افکار سے ستاروں کی گزرگاہوں میں اس انسانِ کامل کے نقشِ پا کو تلاش کرتا ہے جس کے لئے کائنات معرضِ وجود میں آئی۔ وہ کتابِ مقدّس میں نغمۂ سلمان سے متاثر ہو کر اس انسانِ کامل کو ڈھونڈ نکالتا ہے جس کی پیشوائی کے لیے ایک عظیم انسان صلیب تک پہنچ گیا تھا چنانچہ "فارقلیط" کا لفظ نشانِ منزل بن کر اس کے فکری سفر کو مدحتِ رسول صلعم کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور وہ پکار اُٹھتا ہے کہ یہ تو اسی انسانِ کامل کے بارے میں پیشین گوئی ہے جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا۔ وہ اس بات پر نازاں و شاداں ہو جاتا ہے کہ اس کے وجود کا تعلق اور رشتہ بھی اسی عظیم المرتبت انسان کی اُمّت سے ہے اور یہ احساس اس کے عقیدے کو اور مضبوط اور پختہ بنا دیتا ہے اور اس مینارۂ نور کے حضور نہایت ہی عجز و انکساری کے ساتھ اعتراف کرتا ہے ؎

میں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے　　میں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے
شہنشاہِ لولاک و مولائے سدرہ　　تو میرے تخیّل سے بھی ماورا ہے

خالد نے یہ سب کچھ اپنی فکری کاوشوں اور عملی تگ و دو سے حاصل کیا ہے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، سیرت اور افکارِ عالیہ کے حوالوں سے اپنے اشعار کو سنوارنے اور نکھارنے کا بیڑا اُٹھایا۔ گو اسے اسی بات کا کامل احساس ہے کہ ؎

کہاں لغت و نامِ رسولِؐ تہامی　　کہاں وہ زباں جو کہ لکنت زدہ ہے

خالد کی شاعری کا سب سے بڑا کمال جو بعض کے نزدیک اس کا عیب ہے اس کے ہاں نئے اور قدرے غیر مانوس الفاظ کا سیلاب اور زورِ بیان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہاں قلم سے الفاظ فوارے کی طرح چھوٹتے چلے جاتے ہیں اور شعر میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ ایسے سجتے ہیں جیسے ؎

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

اُردو شاعری میں اس کی مثال مرزا غالب، علامہ اقبال، ظفر علی خان اور جوش ملیح آبادی کے کلام میں ملتی ہے اور اُردو نثر میں اس قسم کے اندازِ تحریر کے مالک مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جو اردو کے چند جملے ہی لکھ پاتے ہیں کہ فارسی اور عربی کا ہم معنی شعر یا جملہ سامنے آجاتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ عربی ترکیب یا فارسی شعر کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے اہلِ قلم کا فارسی اور دیگر علوم کا وسیع مطالعہ ان کے دماغ میں اس قدر رچ بس گیا ہوتا ہے اور وہ ان زبانوں اور مختلف مضامین پر اس قدر حاوی ہو چکے ہوتے ہیں کہ انھیں یہ تخصیص نہیں رہتی کہ یہ لفظ کس زبان کے قبیل سے تعلق رکھتا ہے اور یہی ان کی قادرالکلامی کی دلیل اور زبانِ اُردو کی عظمت ہے۔

لطف یہ ہے کہ ایسا لکھنے والے خود اپنی اس ادائے فن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ ان کا قاری کس ذہنی یا علمی سطح کا مالک ہے۔ وہ تو "دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام" کی مانند آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انھیں نہ تو وصلہ کی پروا ہوتی ہے نہ تنقید کا خوف اور نہ ستائش کی تمنا۔

خالد اور ابوالکلام آزاد میں جو چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ عظمتِ رفتہ کی یاد ہے۔ دونوں نے غیر معمولی حافظہ پایا ہے۔ دونوں نے اپنے ہم جماعتوں اور اساتذۂ کرام کو متاثر کیا اور ان سے بہت آگے نکل گئے۔ اس ضمن میں مولانا آزاد لکھتے ہیں ؎

"میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جانا کیونکہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔" "غبارِ خاطر"

اور خالد لکھتے ہیں کہ جب میں نے پانچویں جماعت میں :-

فرشتوں سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

کی تشریح کی تو ڈویژنل انسپکٹر سن کر کہنے لگا "جی چاہتا ہے اس لڑکے کو ڈبیا میں بند کر کے جیب میں ڈال کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

(تحریریں)

اور کسے خبر تھی کہ ایک وہی بچّہ آسمانِ علم وادب پر مہرِ درخشاں بن کر چمکے گا اور انسانِ کاملِ حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم کی عظمت و رفعت اور شان و شوکت پر ایسے قطعات رباعیات اور منظومات لکھے گا جو رہتی دنیا تک زندۂ جاوید رہیں گی اور اس بات کا خود خالدؔ کو بھی احساس اور یقین ہے کیونکہ وہ برملا کہتا ہے کہ ؎

خالدؔ ، ملکُ الکلام خالدؔ
مشہورِ انام ، نام اس کا!

ابوالخالق منظور سعید احمد

ذکر اُس پری وش کا

عبدالعزیز خالد سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ان کو اپنے ساتھ پایا۔ اور الحمدللہ اب تک بدستور قائم ہے۔

میں فقط ان کو عبدالعزیز کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ عزیز خالد کی حیثیت سے بہت کم شناسا ہوں۔ شاعری کی معمولی شُدبُد رکھنے کے باوجود جب کبھی ان پر کچھ لکھنے کا مسئلہ درپیش ہُوا۔ تو سیّد ضمیر جعفری کے الفاظ میں "میں دل ہی دل میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا"۔ جعفری صاحب نے تو اپنے مخصوص اندازِ تحریر کے علاوہ قدرے تکلّف سے بھی کام لیا لیکن میرے ہاں یہ حقیقت ہے کہ "میں خالد کی بعض نہیں بلکہ اکثر کتابوں کے نام پڑھتے ہوئے املا کی چولیں بھی درست نہیں رکھ سکتا۔

ذات خالد اور کلام خالد پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کہ شاید ہی کوئی گوشہ باقی بچ سکا ہو۔ اظہارِ عقیدت کے طور پر چند واقعات اور بعض معترضین کے لیے چند جملے لکھنے پر اکتفا کروں گا۔

؎ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلام آفتابم۔ ہمہ ز آفتاب گویم

خالد بچپن سے ہی غیر معمولی شخصیت اور صلاحیت کا مالک رہا ہے۔ ابتدا میں بہت خوبرو اور جاذبِ نظر ہونے کی وجہ سے سب چھوٹے بڑے اس سے پیار کرتے تھے۔ ذرا ہوش سنبھالا۔ تو صلاحیتوں کے ظہور کے باعث مرکزِ توجہ بن گیا۔

ع سالے کہ نکوست از بہارش پیدا

گھر کا ماحول ہو یا دوستوں کی محفل۔ محلے میں ہو یا مکتب میں خالد اپنا مخصوص اور منفرد مقام رکھتا تھا۔

ہمارے گاؤں پرجیاں کلاں کا ماحول نہایت صاف ستھرا، پاکیزہ اور سادہ تھا۔ محبت خلوص اور ایثار عام تھا۔ لوگ عموماً پڑھے لکھے تھے۔ مگر اس حد تک نہیں کہ حال کے آئینے میں مستقبل کو دیکھ سکیں۔ اگرچہ ہمارے اکابرین اور اساتذہ

نے ہمارے لئے بہت کچھ کیا۔ مگر میری ذاتی رائے ہے۔ کہ خالد کی تشنگی جس بحر کی مقتضی تھی۔ وہاں موجود نہ تھا۔ طلب و تمنا کے اعتبار سے اس کا قد اتنا بڑا تھا۔ کہ کوئی لباس اس پر پورا نہ اترتا تھا۔ میرا اب بھی دعویٰ ہے کہ واقعاتی طور پر خالد جس قدر سے ہمارے سامنے آسکا ہے۔ اس سے کئی گنا ابھی مخفی ہے۔

ترک و اختیار پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ جو بھی چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس خیال نے کئی بار میرے ذہن کی سرحدوں کو چھوا ہے کہ خالد پیدائشی شاعر ہے یا اکتسابی جس زمانے میں خالد ذہنی اور فکری طور پر بھی ہمارا دوست تھا۔ دیر تک یہ نہ کھل سکا کہ اس کا پسندیدہ مضمون کونسا تھا۔ شاعری کو تو ہم ایک کھیل کے طور پر استعمال کرتے دوسرے لڑکے جب گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے تو ہم شعروں میں بات کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ یہ دل لگی کس دن دل کی لگی بن کر رہ جائے گی ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی   درماں نیافریدی آزارِ جستجو را

گاؤں کے حلقہ میں خالد کے دوست راقم الحروف کے علاوہ میرے بھائی محمد بشیر (ساہیوال) بشیر احمد (لاہور) عبدالرشید منوّر (لائل پور) اور چند اور لڑکے تھے۔ مگر ہم میں سے کوئی بھی خالد کے مرکزِ آرزو کا سراغ نہ لگا سکا۔ ہماری انہیں کوششوں سے متاثر ہو کر خالد نے ایک غزل کہی۔ جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

ع بحمد اللہ کہ تیغِ ناز کا بسمل نہیں ہوں میں

نہ جانے حقیقت میں کتنی سخت چوٹیں کھا چکا تھا۔ مگر ضبط تھا کہ سب کو مات دے رہا تھا۔

ع درخودی از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

بالآخر وقت کے ساتھ ساتھ خالد کو خود ہی اعتراف کرنا پڑا۔

ع اک حدیثِ صحبتِ خوباں ہے سو نا گفتہ بہ

دراصل خالد آشنائے ہمہ باش و ترکِ ہمہ گیر کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔

اگر خالد انجینئرنگ کی طرف توجہ کرتا تو اس لائن میں بھی سدرہ نشیں ہی ہوتا۔ پھر خالد نے شاعری کیوں شروع کی اس ضمن میں از خود جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں۔ وہ یہ ہے جہاں تک خداداد صلاحیت، قابلیت اور محنت کا تعلق ہے خالد جس طرف چاہتا جا سکتا تھا۔ اور ہر میدان اس کے ہاتھ ہوتا۔ چونکہ خالد طبعی طور پر عاشق مزاج واقع ہوا ہے اور وہ بھی دل پھینک عاشق نہیں۔ بلکہ صاحبِ جذب و ضبط۔ تو یہ ضروری تھا۔ کہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کوئی راستہ اختیار کیا جاتا۔ اور دشتِ طلب و تمنا میں کھو کر جو پایا ہے اس کا کسی نہ کسی طرح اظہار کیا جاتا۔ لہٰذا شاعری ہی ایک ایسا میدان تھا۔ جو خالد کی پہنائیوں اور وسعتوں سے کچھ مطابقت رکھتا تھا۔ جس میں خالد کی پروازِ فکر ممکن تھی۔ خالد کی مشکل پسندی اور وسیع المطالعہ ہونا اس کے جذبۂ ریاضت پسندی کا نتیجہ ہے

وہ اپنی محنت اور مشقت کا رُخ کسی اور طرف بھی موڑ سکتا تھا۔ مگر اُس نے ایسا نہیں کیا اور ڈاکٹر یا انجینئر بن کر شاعری بطور ہابی (HOBBY) نہیں کی۔ بلکہ شاعری کو جزوِ جاں بنایا ہے اور اپنے مشقّت اور محنت پسندی کے جذبے کو مطالعہ اور حصولِ علم پر صرف کیا ہے۔ جو ایک پیغمبرانہ صفت ہے۔ اب وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عالم بے بدل اور محقّق بھی ہے۔ چونکہ اُس کا شاعر اور عالم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں لہٰذا اکثر و بیشتر دونوں کی مُٹھ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کبھی خالد کا علم شاعری میں ڈھل گیا اور کبھی شاعری مغلوبِ علم ہو کر اس قدر مشکل ہو گئی کہ یہ بحیثیت شاعری پہچانی نہ جا سکی۔ چنانچہ ایک دفعہ خود خالد نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنی ایک تصنیف ڈاکٹر محمد حسن پروفیسر دہلی یونیورسٹی کو بھیجی تو انہوں نے جواباً لکھا۔ کہ جب آپ کا عالم، شاعر سے شکست کھا جائے گا۔ تو پھر آپ کی کتاب پڑھونگا۔ اس خفیف سے تجزیے سے میری مراد خالد کے علم یا شاعری پر تنقید و تبصرہ نہیں ہے۔ بلکہ میرا موضوع ذاتِ خالد اور اُس کے متعلّقات سے ہے۔ خالد نے شاعری کے لیے اپنی خداداد صلاحیتوں کو جس طرح استعمال کیا ہے اس میں تصوّر اخلاق، فلاحِ انسانیت، عشقِ رسالتمآب اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا جیسے پاکیزہ اور مقدّس عنوانات ملتے ہیں۔ کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ کہ خالد فقط تفریح کے لیے کسی ہوٹل، مجلس یا سینما ہال میں موجود ہو۔ وہ اپنی زندگی کی ایک ایک ساعت اس طرح گذارتا ہے۔ جیسے حساب لینے والا سامنے کھڑا ہے۔

میں اپنی زندگی میں تین شخصیتوں سے بے پناہ متاثّر ہوا ہوں۔ ڈاکٹر سیّد محمد طفیل، سیّد آغا صادق حسین صادق اور عبدالعزیز خالد۔ تینوں میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ ایثار پیشہ ہیں وفا کیش ہیں، صدق و خلوص کے داعی ہیں اور انسانیت نواز ہیں۔ ڈاکٹر سیّد محمد طفیل اور آغا صادق میرا موضوع نہیں ہیں۔ ورنہ اپنے اس دعوے کی تصدیق و تائید واقعاتی اعتبار سے بھی کرتا۔ بات کہیں کی کہیں جا پہنچی۔

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

خالد نے اپنی زندگی کا ہر دن انتہائی پُر شکوہ، پُر وقار اور پُر عظمت طریقے سے گذارا ہے۔ اُس نے اپنے کردار کو جس سانچے میں ڈھالا ہے وہ اس سے کہیں مختلف ہے جو عام شاعروں نے پیش کیا ہے۔ جس کی بدولت شاعروں کے متعلّق یہ غلط طور پر مشہور ہو گیا۔ کہ شاعر فقط گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ عملی دنیا میں اُن کا کوئی مقام نہیں اگرچہ اس ضمن میں ماضی کے بعض شعراء کا کردار بھی باعثِ تحسین رہا ہے۔ اور موجودہ دور بھی ایسے شعرا سے خالی نہیں ہے۔ مگر خالد ایسے شعراء کا امام دکھائی دیتا ہے۔

ابتدا میں جن دو عظیم شخصیتوں نے خالد کے کلام کا مذاق اُڑایا تھا۔ آج وہ ہستیاں خالد کے مقالہ نگاروں میں شامل ہیں۔ اختلاف کی ہر دیوار مسمار ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ فوجِ ظفر موج جو علمِ بغاوت لے کر اُٹھی تھی خود بخود پسپائی پر مجبور ہو گئی۔ کسی نے خالد کو شاعرِ اعظم کہہ کر پکارا کسی نے غوثِ سخن کہہ کر اُس کے آگے سرِ خم کر دیا اور کسی جگہ وہ عبدالعزیز